کیسے سمجھاؤں

واجدہ تبسم

کیسے سمجھاؤں

واجدہ تبسم

رابعہ بک ہاؤس

بخشی مارکیٹ ○ انارکلی، لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ناشر ——— خورشید اے شیخ
ادارہ ——— رابعہ بک ہاؤس
بار اول ——— سنہ ۱۹۷۷ء
تعداد ——— گیارہ سو
مطبع ——— محمد سعید بٹ۔ دنیا آرٹ پریس لاہور
قیمت ——— -/۹ روپے

پھانس

"کسی بھی حالت میں فوراً پہنچ جاؤ ـــــ!"

تار ملتے ہی شازی کی حالت غیر ہو گئی ـــــ تار بھیجنے والے کا نام انور تھا، یقیناً یہ تار اس کے پیاری باجی، نکہت کے میاں کی طرف سے تھا ـــــ انہوں نے کوئی اشارہ تک نہیں دیا تھا کہ کیوں اسے فوراً پہنچ جانے کیلئے کہا گیا ہے، لیکن اس کا دل رہ رہ کر گواہی دے رہا تھا۔ کہ "یقیناً باجی کی حالت نازک ہے ـــــ میرے منہ میں خاک ـــــ وہ بستر مرگ پر ہیں ورنہ ـــــ ورنہ کبھی انور بھائی ایسا تار نہ دیتے ـــــ"

اس صورت میں کہ شادی کے بعد کئی سال گزار لینے کے باوجود آج تک دونوں بہنوں میں کسی قسم کی خط وکتابت نہ تھی اور نہ کبھی ملی ہی تھیں۔

عورت سارے رستے بھول جاتی ہے، لیکن زندگی بھر ایک راستہ کبھی نہیں بھولتی ـــــ میکے کو جانے والا راستہ؛

پھلوارن چاہے کتنی ہی گندی ہو، اس کے پاس سدا پھولوں کی خوشبو آتی ہے، یہی حال میکے کا ہے، میکے میں عورت نے، لڑکی کے روپ میں کیسی ہی تکلیفیں اٹھائی

ہوں، میکے کی یادیں کتنی ہی سنگین کیوں نہ ہوں، پھر بھی ان کانٹوں میں سدا ایک پھول مہکتا رہتا ہے —— یادوں کا پھول! —— سدا بہار پھول!!

غازی تار پاکر تڑپ اٹھی —— اس کے میکے کی بھولی بسری نشانی لے دے کے صرف ایک باجی ہی تو رہ گئی تھیں ماں باپ کبھی کے اللہ کو پیارے ہو چکے تھے، ایک بھائی، تھا جو بچپن ہی میں ختم ہو چکا تھا۔

یادوں کا تمام تر مرکز صرف باجی تھیں، لیکن کس قدر عجیب بات تھی کہ وہ دل و جان سے اتنا چاہنے کے باوجود کبھی نکہت سے مل سکی نہ خط و کتابت کا ذریعہ ہی باقی رہا بات کچھ بھی نہ تھی، بہت سالوں پہلے جب نکہت بیاہی جا چکی تھی، امّی ابا دونوں زندہ تھے ——

شازی ابھی تعلیم حاصل کر رہی تھی کہ اس کے لئے اقبال کا پیام آگیا۔ نکہت اس پیام پر سخت معترض تھی، کا ہے کہ ہم تمہارے برے بھلے کے بارے میں سوچیں، اور شازی! یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ ہم خالہ جی کے پالے ہوئے لڑکے سے تمہاری شادی کر دیں"

خود شازی کا اپنا یہ خیال تھا کہ کم سے کم باجی کی طرح بی اے تو کر ہی لے۔ بری گھڑی پوچھ کر نہیں آتی اللہ نہ کرے کبھی برا بھلا وقت آ گیا تو اتنی تعلیم تو ہے کہ نوکری کر کے اپنا پیٹ آپ پال سکے ——

لیکن اقبال کی دیوانی محبت کچھ بھی نہ ہونے دیتی ـــــ!؟
ایک دو دن ٹلے نہیں کہ وہ اپنی لمبی سی گاڑی لے کر آن موجود!
وہی تاک جھانک کا سلسلہ ـــــ وہی راستہ روک کر ہلکی سی چھیڑ چھاڑ ـــــ

کبھی اس کمرے سے اس کمرے میں جانے تک شازی کو روک لینا اور اظہار محبت کر ڈالنا ـــــ "یقین کرو شازی میں خودکشی کر لوں گا ـــــ اگر تم نے ہاں نہ کی!"

باجی سے یہ ساری باتیں پوشیدہ نہ تھیں، خیر محبت کی سرگوشیاں وہ نہ بھی سنتیں لیکن دن رات تحائف جو چلے آ رہے ہیں، کبھی قیمتی ساڑیاں، کبھی جڑاؤ زیور (جو شازی کی کمزوری تھے) کبھی فارن کی خوشبوئیں ـــــ

کبھی اس اعتراف کے ساتھ میک اپ کا سامان کہ "شازی تم تو خود ایک حور ہو تمہیں میک اپ کی بھلا کیا ضرورت ہے؟"
یہ ساری باتیں تو وہ خود کھلی آنکھوں دیکھ رہی تھیں۔

انہیں اصل اعتراض اقبال کے چھچھورے پن پر تھا، پیسہ پاکر کوئی یوں اپنی اوقات نہیں بھول جایا کرتا، امی ابا کو ذاتی طور پر قطعاً کوئی اعتراض نہ تھا، آنکھوں کے سامنے پلا بڑھا اچھے خاندان کا لڑکا تھا، بازار سے کوڑی پھیرا کر کے سودا سلف لایا تھا۔

دھوبیوں کی طرح دھنا دھن گھر بھر کی غلاظت سے بھرے کپڑے دھوئے تھے، اور گھر پر جو ماسٹر صاحب پڑھانے آتے تھے ان کے آگے بیٹھ کر ہل ہل کر قرآن مجید

پڑھا تھا۔

جوتے کھا کھا کر جھوم جھوم کر آگے پیچھے ڈول ڈول کر ا۔ ب۔ ت سے شروع کر کے پورا قاعدہ ختم کر ڈالا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے پانچویں جماعت میں داخلہ لے لیا تھا اور پھر ایسا بڑھا ایسا بڑھا کہ کسی کے پیسے کی حاجت رہی نہ ہاتھ پھیلانے کی۔

ہر کلاس میں پہلا نمبر آنے پر وظیفہ ملتا رہا اور بی۔اے کر کے جب اس نے خالو صاحب کو سلام کیا تو انہوں نے خوش ہو کر پانچ سو روپے انعام دئے۔ اسی پانچ سو سے اس نے سامان کی چھوٹی سی دوکان ڈال لی ــــــ

جو بڑھتے بڑھتے "اقبال اینڈ سنز" بن گئی پہلے پہلے خاندان بھر میں اس "اینڈ سنز" پر بڑی ہنسی بھی مگر اقبال نے بڑی خوش دلی سے جواب دیا ــــــ "ارے باپ موجود ہے تو بیٹے بھی آ ہی جائیں گے!"

پہلے دوکان میں ایک نوکر بڑھا، پھر دوسرا نوکر آیا پھر دکان وسیع کی گئی۔ پھر فون آیا، پھر گھر خریدا گیا۔ پھر گھر میں فون لیا گیا، پھر فرج کی باری آئی۔

لیکن گھر چھوٹا محسوس ہوا تو بڑی سی جگہ خرید کر خوبصورت سا بنگلہ بنوایا گیا۔ پھر گاڑی آئی، پھر چھوٹی کی بجائے لمبی گاڑی آئی۔ پھر آنکھوں میں حسین خواب آئے خوابوں میں ایک حسین پیکر آیا ــــــ

وہ حسین مورت جس پر دل بچپن سے فدا تھا ــــــ جسے

دیکھنے سے آنکھوں میں ٹھنڈک بھر جاتی تھی اور دل پھول کی طرح کھل اٹھتا تھا۔ جب وسیلے ساتھ ہوں تو انسان چاند پر بھی ہاتھ ڈال سکتا ہے ـــــ پھر شازی تو اسی زمین کا چاند تھی ـــــ

اور لڑکیاں ہوتی ہی اسی لئے ہیں کہ خوبصورت ہوں، پڑھی لکھی ہوں، دنیاوی آداب سے آشنا ہوں تو اچھے بر سے لڑکے آئیں اور بیاہ لے جائیں۔

پھر اقبال میں کون سی کمی تھی ـــــ ؟

یہ سب باتیں امی ابا سوچتے تھے، لیکن پتہ نہیں نکہت کے دل میں کون سی گرہ تھی جو کھلنے ہی میں نہ آتی تھی۔ وہ خود بی اے پاس تھی، خوبصورت تھی، دو پیارے پیارے ـــــ بچوں کی ماں تھی۔ لیکن وہ جو بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ "اولاد مرد کے نصیب سے، دولت عورت کے نصیب سے!"

تو یہ تو خدا کا شکر تھا کہ اس نے صاحب اولاد کیا تھا کہ ایک لڑکی، ایک لڑکا، دو دو پھول عنایت کر دیے تھے، لیکن جہاں تک دولت کا تعلق تھا وہ بس یونہی سی تھی، انور کسی دفتر میں تین سو روپے پاتا تھا۔ اور یہ روپے کھاتے پیتے برابر ہو جاتے تھے۔

نکہت کو گھر کا کام کاج خود کرنا پڑتا تھا۔ کبھی چولہے میں پھونکنی ہوتی ہے، کبھی بچوں کو سمیٹ رہی ہے، میاں کے دوست آجائیں تو خاطر داری کو لپک رہی ہے۔ ایسے میں بچوں کا شور شرابہ، رونا دھونا سکون برباد کر دیتا ـــــ

اقبال کے یہاں کی زندگی تقریباً مغرب زدہ تھی، لمبی سی میز تھی، کھانے والا وہی ایک تھا، مودب بیرا کھانے تک سروس بجاتا رہتا ـــــ پھر آئے دن کی پارٹیاں تھیں جن میں وہ خاندان کے سبھی لوگوں کو بلاتا، جن جن کا نمک کھایا تھا، سبھی کو مدعو کرتا ـــــ اور منہ در منہ ہوتی ہوئی باتیں یہاں سے وہاں تک پھیل جاتیں کہ اقبال تو ایسی زندگی گزار رہا ہے کہ بس ـــــ!

نکہت نے جب کمر ہی باندھ لی کہ اس پیام کو رد کرنا ہی ہے تو شازی کی بھی آنکھیں کھلیں ـــــ کون لڑکی ایک محبت بھرے دل کے ساتھ زندگی کا عیش و عشرت نہیں چاہتی، پھر باجی اس آڑ کو لے کر کیوں بیٹھ گئی ہیں کہ وہ کسی زمانے میں پالا ہوا لڑکا تھا۔

اچھی لڑکی پانے کے لئے تعلیم، شخصیت، وجاہت، دولت اور محبت کے ساتھ ساتھ جو رکھ رکھاؤ ضروری ہوتا ہے وہ سب تو اقبال میں موجود ہے۔ ایسی بے پناہ چاہت پھر پتہ نہیں، نصیب ہو یا نہ ہو، ایک دن اقبال آکر گیا ہی تھا، پاس وہ پیکٹ بھی پڑا ہوا تھا جو شازی نے ابھی کھول کر دیکھا تک نہیں تھا، نکہت ادھر سے گزری تو شازی نے پاس پڑا تکیہ اٹھا کر اس پر رکھ دیا۔

نکہت چڑ کر بولی ـــــ

"اتی ابا بھلے ہی اتنے روشن خیال ہیں تو ہو لیں کہ کسی، کنوارے غیر لڑکے کا آنا جانا، لین دین، ہنسی مذاق مائنڈ نہ

کریں، لیکن شازی! میں ان باتوں کو اچھا نہیں سمجھتی۔"

شازی نے بڑی بڑی خوابناک آنکھیں اٹھا کر کہا۔

"غیر ــــ؟ باجی! جب کوئی لڑکی کسی لڑکے کو اپنے من مندر کا دیوتا بنا لیتی ہے تو کسی طرح کی غیریت باقی نہیں رہ جاتی۔ میں اقبال کو اپنا شوہر مان چکی ہوں!"

دونوں بہنوں میں آج تک اس طرح کی کوئی بات نہ ہوئی تھی اور جو ہوئی تو ایسی کہ کسی قسم کی کوئی جھجک ہی باقی نہ رہی۔ اتنی دیدہ دلیری سے شازی نے کیسے اس کے سامنے ایسی بے محابانہ باتیں کر دیں ــــ؟

اس کی شادی تو ماں باپ نے طے کی تھی، اس نے تو دخل تک نہ دیا تھا۔ پھر یہ شازی کس طرح ایسی آزاد ہو گئی؟"

نکہت نے بے حد غصہ کے ساتھ تقریباً چلا کر کہا۔

"شازی! تم بھول رہی ہو کہ میں تمہاری بڑی بہن ہوں اور یہ کہ ہماری مشرقی تہذیب کے اپنے چند اصول ہیں، کیا تم ایک ایسے لڑکے کو بطور شوہر قبول کر کے خوش رہ سکو گی، جس نے دعوتوں میں بارہا تمہارے جھوٹے ہاتھ دھلائے ہیں ــــ؟

نکہت نے سوچا تھا شازی اس طرح گرا کر یاد دلانے سے اقبال کا بچپنا سوچ کر بھڑک اٹھے گی۔ لیکن اس نے بے حد پیار سے جواب دیا۔

"باجی! وہ ہاتھ جو آج اتنی محبت سے میری طرف بڑھے ہیں بچپن سے ان آنکھوں کے سامنے رہے ہیں ــــ اور پیار

سے جو ہاتھ آگے بڑھتا ہے وہ حقیر نہیں بے حد عظیم ہوتا ہے!"
نکہت حیران رہ گئی کہ شازی اپنے فیصلے پر نظر ثانی کبھی نہ کرے گی۔ نہ وہ بچی تھی نہ جاہل، اپنا برا بھلا خود بھی تو سمجھ سکتی تھی۔

وہ نکہت کی بے بنیاد سی بات کو کہ اقبال کا ماضی ذلیل تھا۔ کسی صورت سے ماننے کو تیار نہ تھی۔ نکہت اسی دن یہ فیصلہ سنا کر اپنے سسرال چلی گئی کہ ــــــ

"میں ایسی شادی میں شرکت کر کے خود کو ذلیل نہیں کرنا چاہتی جہاں نوکروں کو داماد وں کا درجہ دیا جائے ــــــ اور نہ اب میں کبھی شازی سے ملنا ہی پسند کروں گی!"

دن کیسے بیت جاتے ہیں! ہوا کی مانند ــــــ ان کے بھی جو عیش و عشرت میں مگن ہوتے ہیں اور اُن کے بھی جن کی زندگی کی کتاب کا ہر ہر ورق مصیبتوں اور کلفتوں سے عبارت ہوتا ہے۔ ان تمام سالوں میں دونوں بہنوں میں کسی طرح کی خط و کتابت رہی نہ وہ ملیں ہی ــــــ دنیا کا کوئی سکھ ایسا نہ تھا جو شازی نے اٹھا نہ لیا ہو۔ تین پیارے پیارے بچوں کی وہ ایک خوش ترین ماں تھی، جس میں ایک گڑیا سی بیٹی اور دو بیٹے تھے۔ اس طرح اقبال اینڈ سنز واقعی اقبال اینڈ سنز بن چکی تھی ــــــ

سکھوں کے ہنڈولے میں جھولتی ہوئی شازی کبھی کبھی دل میں ایک کسک سی محسوس کرتی ــــــ میکے کی تڑپ، شوہر

کا بے پناہ پیار اسے میسر رہا بچے تھے۔ شاندار دیدہ زیب کوٹھی، ہر جدید فیشن اور فرنیچر سے آراستہ، پہننے کے لئے بے پناہ حسین ملبوسات، کپڑے، جواہرات، سواری کے لئے دو دو خوبصورت کاریں اور میاں کی وہ چاہت کہ نئی نویلی دلہنیں رشک کریں، عیش اور آلام مصورت کو بوڑھاپے کا راستہ نہیں بتایا۔ بتایا ہے تو شوہر کی عدم توجہی، بے قدری، غربت و افلاس اور بدلی نگاہوں نے ـــــ

اسی لئے شازی اتنے سال گزر جانے پر بھی اسی طرح شاداب، جوان اور امنگوں سے بھرپور رہتی، جیسے ڈالی پر کھلا ہوا تازہ تازہ گلاب؛ ان تمام باتوں کے ہوتے بھی کبھی کبھی شدت سے اس کا جی چاہتا،

اپنے میکے کی ایک ہی نشانی، باجی سے ملے۔ باجی سے خوب باتیں کرنے۔ باجی کے ہاں جائے، انہیں اپنے ہاں بلائے، ـــــ ـــــ، انہیں تحفوں سے لاد دے، انہیں ہر ممکن خوشی دے ـــــ۔

بے حد خلوص سے اور محبت کے ساتھ انہیں یہ بھی بتلائے کہ ـــ "دیکھئے باجی آپ کے تمام تر خدشے کتنے بے بنیاد ثابت ہوئے ـــ آپ کو یہ فکر تھی کہ اقبال چھچھورا ہے، وہ مجھے خوش نہ رکھ سکے گا، زیادہ دولت ہاتھ آئی ہے۔ مجھے چند روز بعد مسلی ہوئی کلی کی طرح پھینک دے گا اور نئے نئے وسائل عیش و طرب کے لئے ڈھونڈ لے گا۔ کتنے سارے خدشات آپ کو تھے ـــــ

دیکھئے، اقبال نے مجھے کس طرح خوش رکھا ہے، کس طرح میرے دل کو اپنی محبت سے اور اپنے دل کو میری محبت سے بھر رکھا ہے کہ کہیں بھی زندگی میں ہلکا سا دکھ کا نام و نشان تک نہیں۔

اسی محبت کی فراوانی نے میری جوانی کو کبھی نہ مرجھانے والا سدا بہار پھول بنا دیا ہے۔!"

وہ یہ سب سوچتی لیکن اتنی ہمت نہ پاتی کہ خط لکھے یا انہیں بلائے ــــ

سوچتی اگر باجی نے دھتکار دیا یا میرا محبت بھرا بلاوا قبول نہ کیا تو میں برداشت نہ کر سکوں گی ــــ اقبال بھی شاید اچھا نہ سمجھے۔

اور آج ــــ

اور آج اچانک اسے میکے سے بلاوا آگیا۔ لیکن اس کے دل نے اسے آگاہ کیا، یہ خوشی کا لمحہ نہیں ہے، یہ بُری گھڑی ہے۔ اس کا دل رہ رہ کر کہہ رہا تھا۔ کچھ ہونے والا ہے ــــ تار ہاتھ میں لئے، کتنی ہی دیر تو وہ یونہی گھڑی ماضی کی ہر ہر بات سوچا کی۔ پھر اِک دم تیزی سے اقبال کے کمرے کی طرف دوڑی ــــ

"اقبال ــــ پلیز اقبال جلدی کرو، ہمیں فوراً جانا ہے!"

اقبال ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا ہوا شازی ڈیر؟ اتنی گھبرائی کیوں رہی ہو ــــ ہوا کیا؟"

اک دم شازی بچوں کی طرح رونے لگی ـــــ "اقبال! باجی کی طبیعت بے حد خراب ہے، دیکھ لو انور بھائی نے بلایا ہے"

اقبال اس کی تسلی کے لئے ہنس کر بولا ـــــ "تم تو پاگل ہو میری جان! اس تار سے یہ مطلب کہاں نکلتا ہے کہ اللہ نہ کرے باجی علیل ہیں؟"

"اقبال ـــــ بعض باتیں دل خود سمجھا دیتا ہے تم چلو ابھی چلو پلیز!"

"لیکن اتنے سالوں میں کیا پتہ انور صاحب کا تبادلہ کہیں اور ہو چکا ہو۔ ہمیں ان کا پتہ بھی تو نہیں معلوم، پہلے تو شاید وہ کلکتے ہوا کرتے تھے"

"میں نے تار پر دیکھ لیا ہے وہ کلکتے ہی سے آیا ہے، تم پلیز فوراً پلین سے سیٹیں بک کروالو!"

"میری جان! پریشانی میں تم بالکل بدحواس ہو رہی ہو بغیر ریزرویشن کے ہم اس طرح کیسے ٹکٹ حاصل کر سکتے ہیں ذرا تو سوچو۔ ٹھہرو میں پہلے کال کر لوں ـــ"

جب تک اقبال ٹیلیفون پر بات کرتا رہا شازی کئی بار مری اور کئی بار جی۔

بستر پر ہڈیوں کا ایک ہار سا پڑا ہوا تھا۔ جسے پہچاننے میں شازی کو دیر نہ لگی۔ اُف! اس کی پھول جیسی باجی! اس نے آنسوؤں کو آنکھوں ہی میں پی لینے کی ناکام سی کوشش

کی ــــ

"انور بھائی ــــ باجی کی ایسی حالت کب سے ہے ؟ آپ نے مجھے پہلے سے اطلاع تو دی ہوتی کبھی ــــ"

انور پھیکی سی ہنسی ہنس کر بولا ــــ "وہ اطلاع دیتے دیتی تب نا ــــ ؟ ڈکٹرز ، نے آخری اسٹیج بتایا ہے میں نے سوچا اب تو آپ کو اطلاع دے ہی دوں"

وہ حالات کے ہاتھوں خاصا بے حس ہو گیا تھا، بے حد احساسات سے عاری لہجہ میں وہ نکہت کی بیماری کی تفصیل دیتا رہا ــــ اتنے مین نکہت نے آنکھیں کھول دیں ــــ ادھر ادھر دیکھ کر پھر سے موند لیں۔

وہ کہہ رہا تھا ــــ

"کئی بار ایسا ہو چکا کہ معلوم ہوتا ہے آخری لمحہ آگیا لیکن جانے کون سی پھانس ان کے دل میں اٹکی ہوئی ہے کہ پھر وہی حالت، وہی تکلیف، وہی حالت ہو جاتی ہے، لیکن مشکل آسان نہیں ہو چکتی"

شازی نے کمرے پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی، انتہائی غربت کا مظاہرہ ہو رہا تھا۔ تین سو روپے پانے والا شوہر اتنی طویل بیماری سے اگر یوں اکتا جائے تو شاید بے جا نہیں اس نے لرز کر سوچا ــــ

نکہت نے ایک بار اور آنکھیں کھولیں اور جیسے شازی کو بہت کوشش سے پہچان کر دھیمے دھیمے بولی۔

"ارے ــــ تو ــــ شازی ..... ؟"

شازی اس پر جھکی، آنسوؤں کے مارے بات نہ نکلتی تھی۔

"ہاں باجی! انور بھائی نے مجھے تار دیا اور میں اڑی چلی آئی ــــ اب آپ..." لیکن نکہت نے بات کاٹ کر دھیمے سے پوچھا۔

"اڑی چلی آئی ــــ؟ پلین سے ــــ؟ لیکن مجھے تو.... کسی نے بتایا تھا کہ..... اقبال کی فرم ڈوب گئی .... وہ دیوالیہ ہو گئے .... پھر...."

اک دم شازی کی آنکھوں سے بادل ہٹ گئے، وہ سکون کا سانس لے کر بولی۔

"باجی ــــ آپ نے غلط نہیں سنا تھا۔ واقعی ہم دیوالیہ ہو گئے زندگی میں بہت۔ سکھ اٹھالیا تھا باجی اسی کی یہ سزا تھی ....."

نکہت کے چہرے پر ایک چوٹ سی جاگی ــــ "پھر اقبال اب.... کیا کرتے ہیں.... غریبی کے ہاتھوں، پریشان ہو کر..... وہ تم سے اچھا سلوک تو نہ کرتے ہوں گے؟"

شازی نے اس کے ماتھے پر بے حد پیار سے اپنا ہاتھ رکھ دیا ــ "باجی بس یہ سمجھ لیجئے زندگی ہے، گزارنی پڑ رہی ہے وہ پیار بھت تو ایک خواب تھا جو بیت چکا ــــ"

اب اقبال ادھر انور باہر جا کر باتیں کرنے لگے تھے، اقبال شازی کے اچانک بدلے ہوئے رویے سے سخت بدحواس

ہو کر باہر نکل گیا تھا۔ انور بھی اسی کے پیچھے لپک پڑا تھا۔ انہیں جاتے دیکھ کر نگہت نے آخری سوال بہت مشکل سے ادا کیا ــــ "تمہارے بچے ــــ سنا تھا، تین بچے کہاں ــــ ہیں ــــ لائیں نہیں؟"

شازی بے چارگی سے بولی

"باجی اتنا کرایہ کہاں سے لاتی کہ سب کو ساتھ لے آتی ــــ ــــ ــــ، پڑوسن کے ہاں چھوڑ آئی ہوں ــــ" (اس کی آنکھوں میں اپنے تینوں موٹے تازے صحت مند شریر بچے گھوم گئے جو اپنی اپنی آیا پر لدے ہوئے ہوں گے ــــ!)

نگہت کے چہرے پر ایک نور سا چھا گیا۔ اس نے آخری بار بہت محبت سے شازی کے چہرے کی طرف دیکھا اور کہا۔

"ہم دونوں ہی ایک کشتی کی سوار ہیں شازی! ہم... دونوں ہی....."

اور اک دم دیکھتے ہی دیکھتے ایسی آسانی سے اس کا دم نکل گیا جیسے غبارے میں سے ہوا نکل جائے ــــ!

شازی کی چیخوں کی آواز سن کر دونوں مرد کمرے میں لپکے ہوئے آئے۔ انور نے سفید چادر نگہت کے چہرے تک کھینچ دی۔ اقبال شازی کو سنبھالتا ہوا کمرے کے باہر لے آیا۔ وہ اسے چمکارتا ہوا بولا ــــ "شدید غم نے تمہیں بدحواس کر دیا ہے شازی ڈیئر! ذرا کھلی ہوئی ہوا میں سانس لو اور مجھے یہ بتاؤ تم نے نگہت باجی سے"

شازی سسک اٹھی ــــ "تم نہیں سمجھو گے اقبال! تم نہیں سمجھ سکو گے ــــ میں نے باجی کے سینے سے وہ پھانس نکال دی ہے

جس نے انہیں سکون سے مرنے سے روک رکھا تھا... میں یہ
سب نہ کہتی تو وہ کبھی سکون سے نہ مرپاتیں ....»
اقبال واقعی کچھ نہ سمجھ سکا ـــــــ !!

تصویریں

ابھی ابھی چوتھی بار ٹیلیفون کی گھنٹی بجی ہے، اور میں نے اپنے تھرتھراتے ہاتھوں میں ریسیور تھام لیا ہے۔ ریسیور منہ کے قریب لے جاکر میں نے کانپتی آواز سے "یس پلیز" کہا ہے، اور پھر میری آنکھیں بھیگ گئی ہیں۔ میں نے گھبرا کے ریسیور رکھ دیا ہے اور پھر میرے ذہن میں کئی تصویریں ابھرنے لگی ہیں۔

سامنے ہی ٹیبل پر میری تصویر رکھی ہے جو رابعہ نے کھینچی تھی، میرے جسم پر سرخ پھولوں والی ساری ہے، جو تصویر میں کالی دکھائی دے رہی ہے،

میں ٹیبل پر دونوں کہنیوں کے بل جھکی ہوئی ہوں۔ اور ریسیور میرے منہ سے لگا ہوا ہے۔ میرے چہرے پر مسکراہٹ ہے، لیکن نہ جانے میں کیا کہہ رہی ہوں، ..... کہیں تصویریں بھی بولتی ہیں۔ ؟؟؟

لیکن یہ تصویریں کیسی ہیں جو میرے ذہن کے پردوں

پر ابھر رہی ہیں۔ یہ بھی تو تصویریں ہی ہیں۔ پھر ان میں قوتِ گویائی کہاں سے آگئی ؟ کیسے آگئی ؟ یہ تو رنگا رنگ تصویروں سے سجا البم ہے ! میں نے اپنے کانپتے ہاتھوں سے اس البم کے ورق الٹنے شروع کر دیئے ہیں !

میری نگاہوں کے سامنے مارچ اپریل کی ایک خوش گوار سی شام جھولا سی جھول رہی ہے۔

باہر کورٹ میں رانی، شمّہ، دکی اور میں بیڈمنٹن کھیل رہے تھے۔ ڈیڈی پاس کرسی ڈالے ہم لوگوں کا کھیل دیکھ رہے تھے۔ کہ اتنے میں ڈرائینگ روم سے فون کی گھنٹی سنائی دینے لگی۔ ڈیڈی نے پہلے تو اپنے بھاری بھرکم جسم کی طرف دیکھا پھر پیار سے بولے۔

"بلّی ؛ ذرا فون تو ریسیو کر لے بٹیا !"

میں ریکٹ لیے لیے ڈرائینگ روم میں دوڑ گئی، سانس برابر کر کے میں نے ریسیور اٹھایا، اور بہت ملائم سی آواز سے کہا ــــ !

"یس پلیز !"

"ہائے مار ڈالا !"

اِک دم دوسری طرف سے بے ساختہ آواز آئی، میں گھبرا سی گئی، شاید رونگ نمبر مل گیا ہو،

"ہلو ــ !" میں جلدی سے بولی۔

اب کی بار مطلع صاف ہو گیا ـــــ "کیا سویٹ آواز ہے خدایا!"

میں تیزی سے بولی "یہ کیا بدتمیزی ہے؟"

اُدھر سے آواز آئی ـــــ "بدتمیزی نہیں صاحب! آواز ہی ایسی پیاری ہے!"

میں غصہ دبا کر بولی

"سیدھی طرح کہئے، کس سے بات کرنی ہے آپ کو؟"

ہنسی کی مدھم آواز کے ساتھ سنائی دیا ـــ "پہلے تو چاچاجان سے کرنی تھی لیکن اب تو بس آپ ہی سے کر لوں گا۔"

"آپ انتہائی بدتمیز آدمی ہیں!"

میں غصہ سے کانپ گئی۔

"شکریہ!" ہنسی کی کھنک

"اچھا دیکھئے!" میں سنجیدہ ہو کر بولی "اپنا نام بتائیے اور جو کچھ کہنا ہے جلد کہئے، میرے پاس بے کار وقت نہیں ہے، ڈیڈی سے ملنا ہو تو یوں کہہ دیجئے!"

پھر ہنسی کی آواز سنائی دی۔

"پہلے اپنا نام بتا دیجئے!"

"بلّی ـــ!" میں نے عاجز ہو کر کہہ دیا۔

"اوہ بلّی، تب تو پھر میں یقیناً بلّا ہوں، میاؤں، میاؤں!!"

اور لائن کٹ ہو گئی۔

ابھی میں باہر نکلی ہی رہی تھی کہ پھر گھنٹی بجی، میں

نے ریسیور اٹھالیا۔

"جی میں یہ کہنا بھول گیا تھا کہ اب سے جب کبھی میں فون کروں تو آپ ہی ریسیو کیا کیجئے، میرا نام ریاض ہے۔ کیا سمجھیں محترمہ؟"

"کس کا فون تھا بیٹی؟" ڈیڈی نے پوچھا

"کوئی ریاض صاحب تھے، خیریت پوچھ رہے تھے۔" باقی ساری باتیں پی گئی۔

"اچھا — ریاض — اہو ہو ہو — شریر لڑکا، روزانہ خواہی نخواہی فون کرتا رہتا ہے۔" ڈیڈی بے ہنگم قہقہے لگانے لگے۔

یادوں کی یہ شام کتنی سہانی ہے۔ جیسے آبشاروں کا ترنم میری زندگی میں رچ بس گیا ہو۔

دکی اچک کر میز پر بیٹھ گیا اور آنکھیں نچا کر بولا

"اور آپی! یہ تو بتایئے آپ ہمارے لئے کیا لائی ہیں علی گڑھ سے؟"

"جلے — میں علی گڑھ پڑھنے کے لئے گئی تھی۔ تحفے بٹورنے کے لئے نہیں۔" میں مسکرا کر بولی۔

"اچھا یہ بات ہے؟ تو دیکھ لیجئے اب کون اپنے ساتھ لے جاتا ہے آپ کو شاپنگ کے لئے!"

"تو تم سمجھتے ہو میں اکیلی نہیں جا سکتی؟" اور میں نے اپنا منہ چڑا دیا۔

"جا کیوں نہیں سکتیں صاحب! مگر...." وہ رک

گیا " اپنے ریاض بھائی آجائیں ذرا ، ایسے ایسے بہتوں کو ہم نے ٹھیک کر دیا ہے "

میں نے چونک کر اسے دیکھا

" ریاض بھائی ، ریاض بھائی کون ہیں ؟"

" ہونہہ ! بے چاری چار سال علی گڈھ میں کیا رہ آئی ہیں کہ سارے عزیزوں کو بھول گئیں ۔ تایا ابا کے لڑکے کو نہیں پہچانتی ہیں آپ ؟" اور وہ زور زور سے ٹانگیں ہلانے لگا ۔

" چار سال پہلے میں آئی تھی تو وہ جناب دلی گئے ہوئے تھے ۔ یاد ہے ؟"

" جی ہاں یاد ہے " وہ ناک چڑھا کر بولا " مگر پھر بھی اتنا بننا کچھ اچھا نہیں لگتا "

" ایسا برا بھائی کسی بہن کے نہ ہوگا " میں ذرا جھلا کے بولی ۔ " بات کرنے کا ڈھنگ نہیں ، اور بہن بے چاری اتنی دور سے آئی ہے "

وہ میز سے اچک کر میرے گلے میں لٹک گیا ۔

" اچھی آپی ، پیاری آپی بس اب تو خوش ہو "

میں ہنس پڑی

" ہاں ہاں خوش ہوں بابا ، مگر ذرا دور تو ہٹو دکی اب کی بات کہہ دو ذرا !"

" کیا ؟" وہ مستعد ہو گیا ۔

" بات یہ ہے کہ میری کامیابی اور واپسی پر بہت سارے

لوگ پارٹی مانگ رہے ہیں، کیا ارادے ہیں؟"
"تو بس کر ڈالیں، ڈر کا ہے کا؟"
"اتنے لوگوں کو دعوت دے گا کون؟ جن لوگوں کو میں پہنچانتی تک نہیں۔ اور اتنا سارا انتظام کون کرے گا؟" میں ذرا پریشانی سے بولی۔

"اچھا؟"

اور وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر شرارت سے ہنس پڑے۔

ہم سب مل کر مستعدی سے کام کرتے رہے بڑے ہال میں ہم نے امی کی جہیز والی بڑی شطرنجی بچھا کر اس پر قالین بچھایا قرینے سے صوفہ سیٹ لگا کر کرسیاں لگائیں، دروازوں پر صوفہ سیٹ سے میچ کرتے ہوئے نیلے پردے لگائے۔

اسی کی مناسبت سے نیلے پھول ٹوکریوں میں سجا کر اسٹینڈ میں لگائے گلدان میں نیلے اور سرخ پھول بھر دیئے باورچی کو اچھی اچھی چیزیں پکانے کے لئے کہہ کر ہم سب لڑکیاں کپڑوں پر ٹوٹ پڑیں۔

شمہ کا کہنا تھا میں ہرے رنگ کی وہ ساڑی پہنوں جس پر کالے رنگ کے بڑے بڑے پھول تھے، رانی کہتی تھی میرے رنگ پر سرخ رنگ خوب کھلتا ہے ادھر دولہا صاحب کا اصرار تھا کہ میں بھورے سے رنگ کی وہ سلکن ساری پہنوں جس کا رنگ بالکل میری آنکھوں اور بالوں جیسا تھا۔

میں نے وکی کی پسند کی ہوئی ساری نکالی اور جب ڈریسنگ کر کے میں باہر نکلی تو شمہ نے ایک آوازہ کسا۔

"آج تو سب کو جگر تھام کر بیٹھنا پڑے گا"

رانی نے اپنی شرمائی شرمائی ہنسی کے ساتھ کہا "آج چاند نہ بھی نکلے تو بات بن جائے گی"

وکی بہت پیار سے بولا "اچھا بلی کو زیادہ ستاؤ نہیں" وہ اور بھی گھبرا گئی۔

"اف! یہ کیا مصیبت ہے میں تو کسی کو پہچانتی بھی نہیں۔"

"واہ! دعوت آپ کے سلسلے میں اور ریسیو ہم کریں اُوں ہوں! یہ نہیں ہو سکتا!"

شمہ ایسے موقعوں پر ہمیشہ خود کو بچا لے جاتی۔

"ارے میں تو آپ کے ساتھ رہوں گا، میں کس مرض کی دوا ہوں؟" وکی سینہ ٹھونک کر بولا۔

پورچ میں ہم نے ہر طرف پھولوں کے گچھے سجا رکھے تھے۔ چار پانچ بجے سے کاروں کا سلسلہ شروع ہو گیا، ہال بھرتا چلا گیا، مہمانوں کو ریسیو کرنے میں اور وکی کھڑے تھے اکدم میری نظر سامنے والی باڑھ پر پڑی۔

"ہائے وکی! معلوم ہوتا ہے مالی وہ ڈالی کاٹنا بھول گیا"

وکی زور زور سے ہنسنے لگا۔ واللہ آپی! کتنی مسخری معلوم

ہو رہی ہے وہ ڈالی!"

"اچھا تم ٹھہرو یہیں، میں اسے برابر کر کے آتی ہوں"

سیڑھیاں پھلانگ کر میں باغ میں پہنچ گئی، میں نے ڈالی برابر کی، ہلنے کی وجہ سے چند پتیاں ٹوٹ گری تھیں میں انہیں سمیٹنے کے لئے ذرا نیچے جھکی ہی تھی کہ اک دم ایک کار آ کے رکی اور دکی بڑی گرمجوشی سے چیخا۔

"ہلو بھیا!"

میں نے اس کے اس طرح شاندار استقبال کرنے پر گھبرا کر سر اٹھایا۔ دکی وہیں سے چیخا۔

"ارے آپی ہو بھی چکا کام، واللہ آیئے تو۔"

اجنبی نے مجھے پلٹ کر دیکھا۔

ایک لمحہ کو ٹھٹک سا گیا، اور پھر مسکرا کر دکی سے مخاطب ہو گیا۔

"آپ کی تعریف؟" اس کا اشارہ میری طرف تھا۔

"ہونہہ!" دکی اپنی شرارت سے باز نہ رہ سکا "تعریف ہو ہی کیا سکتی ہے؟ یوں مجھے بڑی بہن کا ارمان ہے تو دل رکھنے کو انہیں آپی کہہ ضرور لیتا ہوں، ویسے سب کا کہنا یہ ہے کہ ڈیڈی نے انہیں ایک بھوکی بجارن سے دو سیر چاول میں خریدا تھا۔

"دکی ــــ!"

میں بے بسی سے چیخی۔

اک دم اجنبی نے مجھے ذرا غور سے دیکھا اور پھر دکی

سے پوچھا۔ "آپ کا نام ؟"
وکی زور سے ہنسا۔
"نام ؟ وہ تو آنکھوں، بالوں اور کپڑوں ہی سے ظاہر ہے
بھلا اس طرح کے مجموعے کا نام بلی کے سوا اور کیا ہو سکتا
ہے ؟ ارے ریاض بھائی! آپ بھی کمال کرتے ہیں بس
کس کا ذکر لے بیٹھے۔ چلئے، بھئی اندر!"
"بلی ــــ!"
"ریاض ــــ!"
ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ دوسرے لمحہ وہ
اپنے لمبے لمبے قدم اٹھاتا، مسکراتا اندر چلا گیا۔ جاتے جاتے اس
نے سیٹی بجائی اور مڑ کر بولا۔
"میاؤں میاؤں !!"

کتنی نادان ہوں میں! میرا خیال تھا کہ شامیں سبھی حسین
ہوتی ہیں، خوبصورت قوس قزح کی طرح رنگین، لیکن
یہ بیتے دنوں کی بات ہے۔ اب تو جھلمل جھلمل آنسوؤں
کی چلمن سے مجھے وہ گئے دن نظر آتے ہیں تو میرا دل کٹ
کے رہ جاتا ہے۔ ذہن کے پردے پر یہ کیسی تصویر ہے
جو اتنے دن گزرنے پر بھی مدھم نہیں پڑی، اس دن ہال،
بالکل کھچا کھچ بھر گیا۔ بیٹھنے کے لئے جگہ ہی نہ تھی۔ مجھے بیٹھنا
بھی پڑا تو بالکل ریاض کی بغل میں۔

پاس بیٹھی ہوئی ایک خاتون نے ریاض سے میرا تعارف چاہا۔ وہ مجھے سنانے کے سے انداز سے بولا۔

"سنتا ہوں چچا کی بیٹی ہیں، ویسے جھوٹ سچ کا حال اللہ کو معلوم کیونکہ جب یہ یہاں تھیں میں یہاں نہ تھا۔ اور جب میں یہاں تھا یہ یہاں نہ تھیں"

"یہ کیا بات ہوئی؟" وہ حیرت سے بولیں۔

وہ ہنس پڑا، وہی کھنکھناتی ہنسی جو میں نے فون پر سنی تھی۔

"میرا مطلب ہے، یہ علی گڑھ سے نئی نئی آئی ہیں"

"بہت پیاری شکل پائی ہے ہے نا؟" وہ ریاض ہی سے مخاطب تھیں۔

"جی ــ جی ــ" ریاض گھبرا گیا اور میں کٹ کے رہ گئی۔

پارٹی کے بعد سب ادھر ادھر بکھر گئے، ریاض نے وکی کو جا پکڑا۔

"قسم اللہ کی یار تم نرے گدھے ہو!"

"ہوا کیا؟" وہ سٹ پٹا گیا۔

"یعنی یہی کہ اتنے زمانے سے کبھی تو ذکر کیا ہوتا" میں نے ریاض کی طرف دیکھا تو اس نے پھر وہی انداز اختیار کیا "یہی کہ دیکھو نا کتنے چوہے ہو گئے ہیں ــ بلی تو....."

گرما کی خوشگوار سی ہوا بھی میرے کانٹے چبھو گئی۔ میں کانوں کے گرد ساڑی لپیٹے ہوئے جلدی جلدی جانے

لگی تو شرارت بھری آواز سنائی دی۔ "یس پلیز!"
میں نے مڑ کے دیکھا تو وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔
میں سیڑھیاں چڑھ رہی تھی تو پھر آواز آئی۔
"میاؤں میاؤں!!"

زمانہ بیت رہا ہے۔ بیتا جا رہا ہے، راہیں کتنی جلدطے ہو رہی ہیں، کیا منزل میرے قدم چومے گی؟ میں بیٹھی ہوں۔ اس میز کے قریب، جہاں فون رکھا ہے، اور اپنی بے نور سی آنکھوں سے ماضی کے جھروکوں میں جھانک رہی ہوں، میرے ہاتھوں میں کوئی البم نہیں، کوئی تصویر نہیں۔ پھر یہ دھندلے دھندلے سائے جیسے کیا تیر رہے ہیں؟ مجھے اپنی ایک عادت یاد آ رہی ہے، میں ہمیشہ اپنے البموں کے پہلے صفحے پر کوئی شعر لکھ دیا کرتی تھی، ایک بار ایک البم پر میں نے یوں ہی ایک شعر لکھ دیا تھا ؎

کھو کے مت رو مجھے اے شمعِ شبستانِ حیات
زندگی لوٹ کے آئے گی نہ پروانے کی

لیکن اب جو یہ تصویریں میری نگاہوں کے سامنے ناچ رہی ہیں تو میں سوچ رہی ہوں اس البم پر میں نے ایسا کون سا شعر، ایسا کون سا غم ناک شعر لکھ دیا تھا جو میرا مقدر بن کر رہ گیا، پروانے کی زندگی تو کبھی بھی لوٹ کر نہ آئے گی پھر یہ آنسو! یہ شمع کے جلتے جلتے آنسو، اور یہ لمحہ بہ لمحہ رنگ بدلتی تصویریں ــــ؟؟

چڑیا دوُر جاگری اور اس کے ساتھ ہی ہم نے اپنا کھیل ختم کر دیا۔

وکی جلّا اُٹھا۔

"یہ آپی تی بچّی سدا ہار نے پر آتی ہے تو بے ایمانی کرتی ہے"۔

ڈیڈی ہنس کر بولے۔

"اچھا تو یہ سمجھ لو تم جیت گئے"۔

وہ روتی آواز سے بولا "یوں مزہ نہیں آتا"۔

"ارے یوں لڑکیوں کی طرح بسورو تو نہیں۔ پھر کسی دن نبٹ لیں گے"۔

ریاض اس کی پیٹھ تھپ تھپاکر بولا "ویسے اصل بات تو یہ ہے کہ لڑکیوں کی ذات کچھ بے ایمان ہی ہوا کرتی ہے"۔

میں نے جل کر اس کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ کبھی میری طرف نہ دیکھتا تھا

ڈیڈی اٹھ کر اپنے کسی دوست سے ملنے چل دیئے ہمیں لوگ رہ گئے۔ ڈیڈی کے جاتے ہی سارے بچے آ گئے۔ ریاض نے ایسی ایسی گپیں ہانکیں کہ میں بہت مشکلوں سے ہنسی ضبط کر پائی۔ سب بچے حیرت سے منہ کھولے ہنستے رہے۔ اکدم میں نے محسوس کیا کہ باتوں ہی باتوں میں بچوں کی آڑ لے کر وہ ایسی باتیں کہہ رہا ہے جس کا مخاطب بس مجھ ہی سے ہو سکتا ہے۔ میں گھبراکر اٹھ کھڑی ہوئی۔ میرے کان سُن سُن کر رہے تھے۔ پیچھے سے مجھے آواز آئی۔

"بچوں! تمہیں معلوم ہے ایک دیش ہے جہاں کے پھول بھی باتیں کرتے ہیں۔ ہماری تمہاری طرح چلتے پھرتے ہیں"

میں نے حسبِ عادت اسے پلٹ کر دیکھا تو وہ ہمیشہ کی طرح ڈالی پر لگے گلاب سے مخاطب ہو گیا۔

"تمہیں حاصل کر لیا تو سمجھو دنیا حاصل کر لی دوست!" ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور گلاب دور ہو گیا۔

گلاب کے پھول کے ساتھ سدا کانٹے ہوتے ہیں، یہ بات مجھے اس وقت معلوم نہ تھی۔ جب تو میں نے یہ سوچا تھا کہ اگر ریاض کو پھول پسند ہے تو وہ ہاتھ بڑھا کر توڑ کیوں نہیں لیتا۔

لیکن گلاب کے پھول میں یہ حسن نہ ہوتا اگر اس کے ساتھ کانٹے نہ ہوتے۔ ہنسی اسی لئے تو پیاری ہوتی ہے کہ آنسوؤں کی پالکی میں سوار ہو کے آتی ہے، بغیر غم کے خوشی ہی کیا؟

لیکن یہ کیسی ہنسی تھی، کیسی خوشی تھی کہ آنسوؤں کے دریا میں بہتی چلی گئی۔ اور پھر ہنسی چلی گئی، آنسو رہ گئے، آنسو ہی آنسو!!

گھبرا کے میں نے پٹی کھول دی "بھئی ہم سے نہیں ڈھونڈا جاتا"

"میں کہتا ہوں نا" دکی کا پارہ چڑھ گیا۔ "اب سے اس

گڑھی کو کبھی ساتھ نہیں کھیلنے دیں گے۔ بے ایمان کہیں کی ــــ"

"اے ــ میں تم سے بڑی ہوں جی!" میں چلائی

"بہت دیکھے ایسے بڑے!" وہ چڑ کر بولا "عجیب لڑکی ہے، پھر آنکھ مچولی کھیلنے آئی کیوں تھی؟"

ریاض بہت آہستگی سے کہہ گیا، صرف میں ہی سن سکی۔

"چور ڈھونڈنا بہت مشکل کام ہے؛ اور پھر دل کا چور!"

میں نے اسے دیکھا تو وہ ہمیشہ کی طرح، جھٹ سے آنکھیں اٹھا کر چاند سے باتیں کرنے لگا؛

"تمہارے دم سے میں نے اپنے دل میں چاندنیاں بھر لی ہیں، کہیں بدلی میں نہ چھپ جانا۔"

کھیل بگڑ گیا تھا، دل غصہ ہو کر چلا گیا تھا۔ دوسرے چھوٹے بچے وہیں "چڑی چھپا کا" کھیلنے میں جٹ گئے۔ میں رانی کا ہاتھ پکڑ کر جانے لگی تو سنائی دیا۔

"قسم اللہ کی بلی! گھبرا کر دیکھا تو ریاض پیلی بلی کو گود میں لیے اس کے کان سے منہ لگائے ہنس رہا تھا۔

رانی کچھ جھلا کے بولی۔

"اللہ جانے ریاض بھائی کو بلیوں سے اتنی رغبت کیوں ہے؟"

میں بری طرح جھینپ کر رہ گئی۔

یادوں کا دامن تار تار ہو رہا ہے، کیسی کیسی دلخراش یادیں !!

دریا تو دریا ہیں سمندر بھی میری آنکھوں میں سما جائیں تو رو تے نہ تھکوں، ریاض اور میں کتنی تیزی سے ایک دوسرے کے قریب آرہے ہیں۔

یہ گرما کی، موتیا کے پھولوں سے مہکتی شامیں، یہ جاڑوں کی سرد سردسی شامیں، یہ برسات کی رم جھم رم جھم شامیں، رم جھم برسنے والی شامیں سدا حسین ہوتی ہیں آج کی شام بھی تو رم جھم برسات لے کے آئی ہے اپنے دامن میں! یہ برسات؛ یہ آنسوؤں کی جھڑیاں!

تین بار فون کی گھنٹی بجی اور چوتھی بار میں نے ریسیور منہ سے لگالیا۔

"یس پلیز!"

"بس بس، میں آگے ہی مرچکا ہوں" ہنسی کی آواز آئی یہ ریاض ہی تھا نا؛

شام کو رجی کی سالگرہ کا جشن تھا، کتنے ہنگامے، کتنے رنگارنگ پروگرام کتنی دھوم دھام، وہ بھی تو آیا تھا۔ کیسی جگمگاتی شام تھی۔ اور اس دن جیسے سارے ناملے طے ہو گئے تھے۔

جیجی نے لان میں بیٹھ کر بلبل ترنگ پر گانا سنایا تھا دکی نے گدھے، گھوڑے، مرغے اور کتے کی نقلیں اتاریں ننھی روبی نے انگلش ڈانس کا پوز بتایا۔

جو انہیں کانونٹ میں سکھلایا ـــــــ I LOVE YOU ـــــــ
گیا تھا۔
بیٹھے بیٹھے ریاض نے آسمان کی طرف دیکھا اور بولا۔
"کتنے ستارے ہیں آسمان پر، لیکن ان میں ایک تارہ سب سے زیادہ روشن ہے۔ یہ بیچ والا ـ"
"ایسا کیوں ہے بھیا، سبھی تارے ایک سے کیوں نہیں ہیں ؟" روبی نے پوچھا۔
"بہت گہرا جواب دیا ریاض نے
" دل میں کتنی ساری تمنائیں ہوتی ہیں۔ کوئی چھوٹی کوئی بڑی۔ لیکن ایک تمنا ان سب تمناؤں سے بڑی ہوتی ہے۔ چاہے وہ کوئی سی ہو۔"
اس نے باری باری سب کے چہروں کا جائزہ لیا، کوئی کچھ نہ سمجھا " جیسے یہ روشن ستارہ ہے نا ؟" کتنی آہستگی سے اس نے کہا تھا۔ـــ "بھلا کوئی بوجھے تو۔ میرے دل کی سب سے روشن تمنا کون سی ہے ؟"
لیکن اس نے مجھے نہیں دیکھا، میری آڑ نے لے کر پھولوں کلیوں اور ستاروں سے بات کرنے کی یہ ادا اس نے کہاں سے سیکھ لی !
رات بستر پر لیٹ کر میں نے کھڑکی میں سے جھانکا۔ میری آنکھوں کے بالکل اوپر ہی وہ ستارہ چمک رہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں دعا مانگی
"میرے خدایا ، یہ ستارہ سدا یوں ہی جگمگاتا رہے۔

اب مجھے یہ بھی بتانا ہوگا یہ ستارہ کیسے جگ مگاتا تھا ــــــ ؟؟

بادل چھاتے ہیں، گرجتے ہیں اور برس جاتے ہیں، نہ برسیں تو کیا ہوتا ہے، آسمان بوجھل ہو جاتا ہے میرے دل کا آسمان بھی اس لمحہ بوجھل ہوا جا رہا ہے، بادل چھا چکے ہیں. لیکن برسنے کے کوئی آثار نہیں ہیں۔

یہ یکایک برسات رک کیوں گئی، برس جاؤ اے بادلو، ورنہ یہ دل پھٹ کر رہ جائے گا، اب میں اپنے البم کی سب سے غمناک تصویر ڈھونڈ رہی ہوں، میں چاہتی ہوں اس تصویر کو دیکھ کر میں رو پڑوں، یہ میرے دل پر پتھر کی سل جیسی کس نے رکھ دی، یہ بادل برسنے کیوں نہیں؟ برسات کے موسم کا حسن تو اسی میں ہے کہ رم جھم بارش ہوتی رہے۔

یہ تصویر میرے سامنے ہے اور اب میرا دل پگھلتا سا محسوس ہو رہا ہے، میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں، میرا دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا ہے کہ مجھے اس کی دھڑکن تک سنائی دے رہی ہے۔

میں نے اپنے کانپتے ہونٹ اس تصویر پر رکھ دیئے ہیں کہ کہیں نہیں ہے، اور ہر جگہ ہے، اب میری آنکھوں سے دھند چھٹ رہی ہے اور میں یہ سب کچھ دیکھ سکتی ہوں۔

امی میرے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھیں، ریاض آیا اور امی کے سامنے بیٹھ کر سعادت مند بچے کی طرح کہنے لگا۔

" چچی جان ، میری سمجھ میں نہیں آتا....."
امّی نے مسکرا کر اس کی بات کاٹ دی " تمہیں اتنا سنجیدہ تو آج ہی دیکھ رہی ہوں "

وہ کھلے دل سے ہنس پڑا ۔۔ " میرا جملہ پورا ہوتے ہی آپ خود دیکھ لیتیں کہ میں کس حد تک سنجیدہ تھا "

" ہاں تو کہنا کیا تھا ۔۔ ؟" امّی نے ہنس کر پوچھا۔

وہ پوری سنجیدگی سے بولا " یہی کہ آپ کتنی اچھی ہیں !"

امّی ہنس پڑیں " بہت شریر ہے ۔ نا ۔ !"

اتنے میں بچوں کی ایک ٹولی آئی اور محفل کا رنگ بدل گیا، امّی اٹھ کر چلی گئیں، وہ ٹیبل پر جھکا اور ریسیور ہاتھ میں لے کر بولا

" پھر تو وہ میٹھی آواز سنانا ۔۔ " یس پلیز !"

میں نے گھبرا کر دیکھا، لیکن وہ بچوں میں رل مل گیا، دروازے میں وکی اپنے لمبے لمبے ہاتھوں میں سے کتے کے کان پکڑے گھسیٹتا داخل ہوا۔ میں وہیں سے چیخی ۔۔

" یہ کیا بد تمیزی ہے وکی ۔۔ ؟"

" بسکٹ کھلائے اپنے حصّے کے، وہ احسان گیا چولہے میں، الٹی پھٹکار پڑ رہی ہے ہونہہ !" وہ خفا ہو گیا۔

" کیا بات بات پر خفا ہوتے ہو دوست ؟" ریاض نے اسے منا لیا " مگر کتا ہے بہت اچھا "

وکی من گیا۔

"ہاں اور کیا ـــــ بے چاری آپی کو دو ہی چیزوں سے تو پیار ہے بس دنیا میں، طوطا یا پھر کتا، پھر ذرا نیچی آواز سے بولا "مگر اللہ جانے بلی کتے کی بنہ ہی کیسے جاتی ہے؟"

میں جل بھن کر رہ گئی۔

"ہائیں!" ریاض حیرت سے چیخا "طوطا"

"ہاں اور کیا؟" وکی بیزاری سے بولا "سارے زمانے کی باتیں پوچھ لیجیے ان کے طوطے سے!"

"اچھا تو یہ سلسلے ہیں!" وہ مسکرا کر رہ گیا۔

میں نے اس کے اس طرح پوچھنے پر اس کی طرف دیکھا تو وہ اتنے میں روبی کی ٹھوڑی پکڑ کر ہنستے ہوئے کہنے لگا تھا۔

"روبی گڑیا، اگر تمہاری آنکھیں جو بھوری ہوتیں نا، تو بس ہم تم ہی سے شادی کر لیتے!"

روبی تن تنا کر بولی اٹھی۔

"تو پھر آپی ہی سے کر لیجیے نا ـــــ اُن کے تو بال بھی، بھورے ہیں۔"

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس وقت میرے ہاتھوں میں کتاب تھی جس کی آڑ میں میں نے خود کو محفوظ کر لیا تھا۔

باغ میں جام کی ڈالی سے میں نے اپنے طوطے کا پنجرہ لٹکا رکھا تھا۔ آتے جاتے میں اس سے بہت دلار سے پوچھتی "بلو مٹھو پیارے! کیا حال ہیں؟"

"وہ ٹائیں سے جواب دیتا ۔" دعا ہے حضور کی!"

بسر میں پوچھتی۔

"کھانا دانا ملا؟"

وہ بہت اداسی سے کہتا ۔ "غریبوں کو کون پوچھتا ہے ۔!"

اس دن جو میں نے پنجرے کو جھکولا دے کہ پوچھا "ہلو مٹھو پیارے کیا حال ہیں؟" تو وہ بہت اداسے گردن جھکاکر بولا۔

"میں تم سے محبت کرتا ہوں!"

چلتے چلتے میں تیزی سے رک گئی۔ وہ یکساں رٹ لگائے ہوئے تھا۔

"میں تم سے محبت کرتا ہوں!"

"ہلو مٹھو پیارے کیا حال ہیں؟" اب کے میں نے اس کے قریب جاکر پوچھا۔

وہ پھر دہرا گیا

"میں تم سے محبت کرتا ہوں!"

میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"کھانا دانا ملا ۔؟"

وہ پھر دہرا گیا ۔ "میں تم سے محبت کرتا ہوں"

میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ اظہارِ محبت کا اس سے عجیب و غریب طریقہ کسی نے اپنایا ہوگا!

پنجرہ جھکولے کھا رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس

کا چھوٹا سا دروازہ کھول دیا۔ طوطے نے اپنے پر پھڑ پھڑائے اور پھر سے اڑ گیا۔

میں نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی، یہ تو میں ہی تھی، اگر یہ انوکھا پیغام کسی اور کے پاس پہنچ جاتا تو !!'

" میں تم سے محبت کرتا ہوں !"

طوطا اڑا چلا جا رہا تھا، میں نے بہت بے بسی سے اس اڑتے پنچھی سے کہا تھا

" اگر میں ایک ہندوستانی لڑکی نہ ہوتی میرے پنچھی ؛ تو میں بھی اپنے من مندر کے دیوتا کو اپنے دل کی گہرائیوں سے نکلا ہوا سلام بھیجتی ــــ

" میں تم سے محبت کرتی ہوں "

اور پھر ایک دن وہ بچوں کے گھیرے میں بیٹھا انہیں کہانی سنا رہا تھا،

" بس اس شہزادی کے پاس اپنا پیغام پہنچانے کے لئے شہزادے نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ شہزادی کے مٹھو کو سکھا دیا کہ ہر بات کے جواب میں بس یہ کہا کرے۔

" میں تم سے محبت کرتا ہوں "

اور اس دن پہلی بار ــــ بالکل پہلی بار میں ریاض سے مخاطب ہوئی۔

" شہزادے کا پیغام شہزادی تک پہنچ تو گیا، لیکن شہزادی نے لوک لاج کے ڈر سے اپنے پالتو پنچھی کو اڑا دیا، آخر کو طوطے کی ذات بے وفا مشہور ہے، اگر اس کی محبت کا بھانڈا پھوڑ

دیتا تو ؟"

ریاض نے پلکیں جھپکا جھپکا کر دو تین بار تو مجھے حیرت سے دیکھا پھر وہ سنبھل گیا، مسکرا کر بولا۔

"مگر پیغام پہنچا تو سہی!"

میں نے کھوئی کھوئی نظروں سے اسے دیکھا، اور میری نظریں آپ ہی آپ جھک گئیں۔

اقرارِ محبت کی کیسی عجیب رسم تھی خدایا، لب کھلے نہ آنکھیں ہی ملیں اور ہزاروں میلوں کے فاصلے طے ہو گئے یہ فاصلے!

اُن فاصلوں کا خیال آتا ہے، ان دوریوں کا خیال آتا ہے جنہیں آنکھوں کی ایک ہلکی سی جنبش نے طے کر دیا تھا، اب مجھے، آنسوؤں کے ساتھ ان لمحوں کی یاد آتی ہے جنہوں نے کبھی میرا آنچل تھام کر مجھ سے پیار کرنے کی التجا کی تھی، ان بیتے لمحوں کا دامن تھام کر آج میں اپنی آنکھوں کے جلتے بجھتے دیپوں کی روشنی لٹا بیٹھی ہوں۔

کیسی روشنی ہے یہ؟ کیسا اندھیرا ہے یہ؟ کتنے جھل مل کرتے لمحہ، کتنے اداس لمحہ، کتنے مسکراتے گاتے لمحہ، کتنے روتے لمحہ، میرے سامنے ہیں، میں ان تصویروں کو کون سے البم میں سجاؤں میرے محبوب!

آج یادوں نے میرا دل کھرچ کر رکھ دیا ہے، ایک ایک آنسو، ایک ایک داستان کہہ رہا ہے، ایک ایک آنسو ایک ایک تصویر کو اجاگر کر رہا ہے۔ یہ تصویر کیسی ہے؟

ریاض کو اچانک سروس کال آ گیا۔ اس کے جانے میں کل بائیس دن تھے۔ وہ روز آ کر مجھے فون کرتا، میں ریسیور ہاتھ میں تھام کر، کہنیاں ٹکا کر میز پر، بہت ملائم سی آواز میں پوچھتی۔

"یس پلیز!"

"کیا کر رہی تھیں؟"

"سچ سچ بتا دوں؟"

"وہ تو بتانا ہی ہوگا!"

"تمہیں یاد کر رہی تھی!"

"اوہ سوئٹ بی!!"

"ٹرن.... ٹرن..... ٹرن......"

"یس پلیز!"

"کیا کر رہی تھیں؟"

"ٹھنڈے پانی میں تلوے ڈبو کر بیٹھی تھی، گرمی جو بڑھ رہی ہے۔"

"مار ڈالا بی! قسم اللہ کی۔ سفید چمکتے پانی میں وہ گلابی گلابی مخملی تلوے، اچھا ہوا جو میں نہ ہوا، ورنہ مرجانے میں کیا کسر رہ گئی تھی؟"

وہی کھنکھناتی ہوئی ہنسی جو میرے رگ و پے میں سرایت کر گئی ہے۔ ریاض کے جانے میں کتنے کم دن رہ گئے ہیں!!

ریاض کو تو جانا ہی تھا!

میں نے اس دن اپنے دل کی تمام دھڑکنوں کو قابو میں رکھ کے پوچھا تھا۔

"پریوں کی کہانی والے شہزادے ؛ یہ تو بتاؤ تمہارے دل کے آسمان کا سب سے روشن ستارہ کون سا ہے ؟!"

ریاض نے میرے سر کو اپنے دل کے قریب کر لیا۔

"کلیوں، پھولوں اور ستاروں کو راز دار بنا بنا کر پیغام بھیجنے کا وقت چلا گیا۔ اب تو دھڑکتے دھڑکتے دل ہی ایک دوسرے کے راز دار ہیں۔"

میں نے تڑپ کر دیکھا، وہ بھیگے بھیگے لہجہ میں بول رہا تھا ـ!

"پگلی ـــ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں!"

میں نے تو اس پنچھی کو لوک لاج کے ڈر سے اڑا دیا تھا۔ پھر یہ پنچھی کدھر سے آ گیا ؟ کیا اسے دنیا سے ڈر نہیں لگتا ؟ ریاض کا مضبوط دل تیزی سے میرے کانوں کے پاس دھڑک رہا ہے۔

دھک .... دھک .... دھک ..... اتنی مضبوط اور ہم آہنگ دھڑکن، میں کیوں ڈروں ؟ اس دل کی دھڑکن پہ مجھے اعتماد ہے۔ یہ میرے ہی لئے تو دھڑکتا ہے، بھٹکا پنچھی پھر اپنے آشیانے میں آ بیٹھا ہے اور کہہ رہا ہے ـــ

"میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔ میں تجھ سے ....."

لوگ تو کہتے ہیں طوطا بے وفا پرندہ ہوتا ہے، ایک

بار اڑا دو۔ پھر کبھی لوٹ کے نہیں آتا۔ پھر یہ آواز کیسی ہے ؟ یہ پنچھی لوٹ کے آیا کیسے ؟ میں نے تو اسے اڑا دیا تھا نا ؟

یادوں کی اس دھندلی سی شام میں بس دو ہی سائے ہیں، میں اور ریاض ..... ریاض اور میں ..... میں، میرا ریاض ..... !

میں کالی ساڑی پہنے بیڈمنٹن کورٹ کی طرف چلی جا رہی ہوں، ریاض آ کر میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیتا ہے

" بولو بلقیس ! چاند کدھر سے نکلتا ہے ؟"

میں دونوں ہاتھ چھڑا کر اپنا منہ چھپا لیتی ہوں، انگلیوں کی کھڑکیوں میں سے شرما شرما کر ریاض کو دیکھ رہی ہوں۔ جو مجھ سے پوچھ رہا ہے۔

" چاند کدھر سے نکلتا ہے .... کدھر سے ...."

میں مسکرا رہی ہوں۔

شرما رہی ہوں۔

میری تیرہ و تار زندگی سے غم کے اندھیرے مٹ گئے ہیں، چاند کدھر سے نکلتا ہے ؟ کیا مجھے یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ میرا چاند میرے سامنے جگمگا رہا ہے۔؟

کسی نے کہا ہے۔

" زندگی مسرت ہی مسرت ہے !"

میں آنسوؤں کی جلتی مشعل لئے اس شخص کا پتہ ڈھونڈ

رہی ہوں، جس کے ہونٹوں پر سدا بہار مسکراہٹ جس کے پہلو میں غم کی چبھن نہ ہو۔

لیکن کیا میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو سکوں گی۔ وہ چاندنی کدھر چھپ گئی ہے؟ اندھیروں کا کتنا بھیانک کتنا گہرا سایہ ہے میرے خدا؟ کیا میں نے بھی کبھی چاند کا منہ دیکھا تھا؟

میرے اشکوں کے چراغ میرے دامن میں روشنی پھیلا رہے ہیں، لیکن یہ کیسا اندھیرا ہے؟ کہ چراغوں سے چھٹنے کے بجائے اور بڑھتا ہی جاتا ہے، اب ان اندھیروں میں، میں کون سی تصویر دیکھوں؟

سب سائے دھندلے اور مبہم ہیں، جیسے کسی نے تیز دھوپ میں تصویریں کھینچی ہوں، مٹی مٹی اور غیر واضح

بس ایک تصویر باقی ہے، جس پر میری نظریں پتھر بن کر جم گئی ہیں — یہ میری ہی تو تصویر ہے، میرے دلہنا پے کی۔

لیکن اس تصویر کو دیکھنے سے پہلے مجھے وہ تصویریں بھی تو دیکھنی ہوں گی جو دھندلا ضرور گئی ہیں، لیکن یادوں کے اُفق پر اب بھی جھلملاتی ضرور ہیں!

ریاض کو اسٹیشن پہنچا کر اور اسے "سی آف" کر کے جب ہم لوٹ رہے تھے تو نعیم بھیا نے مجھے بھرپور دلاسا دیا تھا۔

"بری بات ہے بلقیس! روتے نہیں یوں۔ اور پھر ریاض ایسے کون کالے کوسوں گیا ہے؟"

انہوں نے اپنا رومال دیا۔

"لو یہ آنسو پونچھ ڈالو، بری بات ہے، لوگ تو سمندر پار چلے جاتے ہیں یہ کیا بزدلی ہے؟"

میں نے آنچل سے آنکھیں صاف کر کے انہیں دیکھا، گھبرا کر دیکھا، سہم کر دیکھا۔

میں آگے ہی کہتی تھی یہ پنچھی ہرا ہوتا ہے۔ پنچھی کی تان کتنی اونچی تھی؟ کیا چاروں کھونٹ اس کی آواز پہنچ گئی ہے کیا ــــ کیا میری محبت کا راز آشکارا ہو گیا ہے۔؟

کار کو دھیمی رفتار پر چھوڑ کر نعیم بھیا نے میری توجہ کو بٹانا چاہا۔

"دیکھو ــــ یہ کنگ کوٹھی ہے ــــ یہ بشیر باغ ہے۔ ــــ اور ہاں دیکھو! تم روؤ نہیں ــــ دیکھو تو تمہارا دل بہلانے کے لئے میں کتنا بڑا چکر کاٹ کے کار گھر لے جا رہا ہوں"

میں نے کانپ کر انہیں دیکھا ــــ

ہمدردی ــــ مجھے اس لفظ سے چڑ ہے، میں نہیں چاہتی کوئی میرے غم پر اپنی آنکھیں نم کرے۔

ستارے ڈوبتے ہیں تو اندھیرا ہو جاتا ہے، یہ بہت پرانی بات ہے ریاض! لیکن ستاروں کے ابھرنے سے جو اُجالا ہوتا ہے وہ کہاں ہے؟

دیکھو نا میں نے کتنے سارے ستارے رو لئے ہیں، مگر یہ اندھیرا؟ مجھے تم سے تو کوئی شکایت نہیں ریاض! کہ تم نے مجھے دکھ دیا، یہ تو میری لازوال دولت ہے جسے میں خوشی

سے سنبھالے ہوئے ہوں۔ جس پر نازاں ہوں۔ لیکن میرے رحمدل ساتھی! کبھی یہ بھی سوچا کہ میرا نازک سا دل اتنے سارے غموں کا بوجھ کیسے سنبھالے گا؟

نعیم بھیّا اس دن میرے آنسو پونچھتے آئے تھے، میرا دل بہلانے کو شہر میں گھماتے ہوئے لائے، اور اب مجھے اس بات کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وہ شہر کے کامیاب بیرسٹر تھے اور تم ڈھائی تین سو روپے پانے والے ایک معمولی سے ڈاکٹر....

اور پھر یہ ہوا کہ زندگی بھر کے لئے نعیم بھائی نے میرے آنسو پونچھنے کا ٹھیکہ لے لیا۔ میرے دل بہلانے کا ذریعہ بن گئے۔ چم چماتی کار اور اونچی سی سفید بلڈنگ ـــــ کیا میرے زخموں کا مرہم ہو سکتی ہے ریاض؟!

کیا محبت کا مارا دل کار میں گھوم کر اور نرم صوفوں پر بیٹھ کر مطمئن ہو سکتا ہے؟

اب مجھے یاد آتا ہے ریاض! کہ اجالا ہوتے بہت دیر لگتی ہے۔ سورج ہو یا چاند گھنٹوں میں اپنی مسافت طے کرتا ہے تب کہیں جا کر اجالا پھیلتا ہے۔

لیکن اندھیرا؟ وہ تو پل بھر میں گھس آتا ہے۔ ذرا سورج کے چہرے پر بدلی چھائی اور اندھیرے چھائے۔ میرے چاند! تم نے بھی تو اپنا منہ بدلی میں چھپا لیا ہے۔ اور اب اندھیروں کا ذکر ہی کیا ہے کہ زندگی ہی آنسو بن کر رہ گئی ہے۔ کبھی کبھی مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں، کائنات کی آنکھ سے ٹپکا ہوا ایک درد بھرا آنسو ہوں جسے

کسی دامن میں پناہ نہ ملی ؟

یہ تصویر دیکھ رہے ہو تم ؟؟

میں دلہن بنی بیٹھی تھی۔ پھولوں، خوشبوؤں، زیوروں سے لدی ہوئی، میرا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ کیا میرے جسم کو ان آرائشوں کی ضرورت تھی ریاض؟ پھر یہ کیسا انصاف تھا۔ ہرطرف کھنکتے ہوئے قہقہے تھے اور بے فکر ہنسی، لیکن تم کہاں تھے اور میں کہاں تھی۔ کیسا کھیل ہے یہ میرے معصوم ساتھی۔ دلوں کی دنیا اجڑتے کیا دیر لگتی ہے۔ ابھی روشنی تھی، ابھی اندھیرا ہے۔ ابھی، مسکراہٹ تھی ابھی آنسو ہیں۔ اور بالوں میں برف کی، راکھ کے تودے!

میں نیم کی دولہن بن کر آ گئی دن گزرتے چلے۔ گئے گزرتے چلے گئے....

اور تم ــــ؟ ہر موڑ پر تمہاری یادوں کے، تمہاری اسٹ محبتوں کے نقش گہرے اور گہرے ہوتے چلے گئے۔ لوگ تو بھول بھال بھی گئے کہ تم نے کبھی خودکشی کی چار دن سوگ رہا اور پھر وہی زندگی اور زندگی کے ہنگامے مرنے والے کے ساتھ کون مرجاتا ہے ریاض! لیکن میں آج بھی ہر روشن ستارے کو دیکھ کر پوچھتی ہوں، جس دل میں تو بستا تھا وہ دل کہا کھو گیا؟

ریاض! تمہارے دل کی دھڑکن بہت مضبوط تھی بہت تیز، مجھے اس پر کل بھی اعتماد تھا، اور آج بھی ہے لیکن یہ جو کچھ ہوا، اس میں میرا تمہارا کوئی قصور ہے؟ آج بھی میرے سینے پر پتھر جیسے رکھے ہیں، لیکن

یہ بوجھ ٹلے تو کیسے ؟ میری حالت دیکھو تو سہی، آنکھیں بے نور سی ہو چکی ہیں، بالکل کم دکھائی دینے لگا ہے۔ ہاتھ تھرتھرانے لگے ہیں۔ بالوں پر برف پڑ چکی ہے۔ اور یہ کچھ مجھے اب آنسوؤں کے ساتھ یاد آتا ہے کہ اس دل کی ہر ہر ادا پر تم کیسے فدا تھے ؟ پھر کیا یہی تمہاری محبت تھی ؟؟

میں نے البم کا ایک ایک ورق الٹ دیا ہے۔ اب کیا رہ گیا ہے۔؟ کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں۔ اب بھی کبھی کسی کا فون آتا ہے اور مجھے ریسیو کرنا پڑتا ہے تو میرے ذہن میں پچھلی تصویریں ابھرنے لگتی ہیں۔

گئے یہ سب کچھ تو ہو گیا ریاض، لیکن میں آج بھی سوچتی ہوں اگر کوئی چپکے سے آکر میرے دونوں ہاتھ پکڑے اور پوچھے۔

"بولو چاند کدھر سے نکلتا ہے ؟"

تو میں یوں چھپانے کو اپنا منہ چھپا تو لوں، لیکن میں کیا جواب دوں گی کہ چاند کدھر سے نکلتا ہے ؟

میرے پورن ماشی کے چاند، تم تو افق کی پہنائیوں میں ڈوب چکے، اب میں کیا جواب دوں گی ؟ میرے بالوں پر برف پڑ چکی ہے۔ ہاتھ کانپنے لگے ہیں بے نور آنکھوں نے بجھے ہوئے چراغوں کا روپ دھار لیا ہے۔ لیکن اب تک بھی کوئی پوچھنے نہیں آیا، نہ سہی، لیکن اتنا بتا دو میرے اپنے ریاض! اگر کوئی آ ہی گیا تو ــــ

تو میں کیا جواب دوں گی ــــ ؟

کیا جواب دوں گی ــــ ؟؟

چاند ستارہ

شاہینہ مسلسل ایک ہی ریکارڈ کو بار بار بجائے جا رہی تھی۔

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا

ہواؤں میں نمی سی رچی ہوئی تھی۔ ادھ کھلے دریچوں سے موتیا کی کچھ بند کچھ کھلی کلیوں سے پھوٹتی خوشبو جیسے ٹھٹکتے سہمتے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ ہوا کا ایک شوخ جھونکا فوزیہ کے چہرے سے ٹکرایا تو اچانک اسے اپنی آنکھوں میں لرزتے آنسوؤں کے گر پڑنے کا خدشہ محسوس ہوا۔ اسی دم شاہینہ نے مڑ کر پوچھا۔

"اے ری بجّو! یہ دیدۂ تر کیا ہوتا ہے؟"

فوزیہ نے گھبرا کر شاہینہ کی طرف دیکھا، پھر اسی لمحہ اس نے ساڑی کے آنچل سے اپنی آنکھیں پونچھ لیں اور قدرے مسکرا کر بولی۔

"تو تو پگلی ہے شنو؛ دیدۂ تر تو کچھ بھی معنی نہیں رکھتا۔ یہ شاعر بھی خوب ہوتے ہیں۔ جو جی میں آئے کہہ دیتے ہیں"

"تو فوزی؛ یہ تم کہہ رہی ہو کہ دیدۂ تر کچھ معنی نہیں،

رکھتا، پر ابھی یہ تم نے اپنی ریشمین ساڑی کے آنچل میں شبنم کے سے قطروں کو جو سمیٹ لیا ہے تو یہ کیا کچھ تھا؟
—— پھر کیوں دیدۂ تر کچھ معنی نہیں رکھتا؟
پھر کہو —— کہو نا ——!"

فوزی نے گھبرا کر شاہینہ کو دیکھا

"تو نے کچھ کہا شاہینہ؟"

وہ حیران اور پریشان سی ہو کر بولی۔

"نہیں تو باجی؛ میں تو خود آپ کی باتیں سنتی تھی، تو سچ دیدۂ تر کچھ معنی نہیں رکھتا؟ آں باجی ——؟؟"

فوزیہ کے کانوں میں شاہینہ کی آواز کہاں پہنچ رہی تھی ریکارڈ کی آواز سارے میں گونج رہی تھی۔

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
پھر مجھے .....

فوزی نے بے بسی سے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں ——

فوزی نے عاجز آ کر اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں ——

"شفیق بھائی؛ آپ تو سچ مچ ناک میں دم کئے رہتے ہیں ——"

"میں نے کیا کیا ہے حضور؟ بچے مجھ سے پوچھ رہے

تھے ہم نے کبھی پری نہیں دیکھی، پری دیکھنا چاہتے ہیں
میں نے دکھا دی۔ اب اس بات سے آپ کی ناک میں
دم آنے کا کیا تعلق ہے، یہ میری سمجھ میں نہیں آتا"
پھر وہ شرارت سے جھک کر مسکرایا۔

"اور یہ تو آپ نے سنا ہی نہیں، میں نے انہیں یہ بھی
تو بتایا ہے کہ کھلی چھت پر جو شہزادہ سویا تھا، جس نے،
شہزادی کا دل لوٹ لیا تھا وہ یہی خاکسار تھا"

"قسم اللہ کی، آپ بالکل ویسے ہیں، میں آپ سے کبھی
نہ بولوں گی۔" اور فوزی اپنی ساڑی کا آنچل سنبھالتی،
بھاگ گئی۔

شفیق اسے جاتے دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا، یوں کہ اس
کا وجود ایک نقطہ میں تبدیل ہو گیا۔ پھر اس نے سر اٹھا کر
آسمان پر چمکتے ہوئے چاند کی طرف دیکھا۔

"چاند میں اور فوزی میں کچھ نہ کچھ رشتہ ضرور ہے" اس
نے مسکرا کر سوچا

کھانے کی میز پر فوزی بالکل بھری بیٹھی تھی، شفیق پلیٹ
سے مچھ بجاتا رہا۔ جب ابو نے پہل کی تو شفیق بھی جت گیا، ابو نے
حیرت سے ادھر ادھر دیکھا پھر کھنکھارتے ہوئے بولے۔

"فوزیہ بیٹی، تم کچھ سست سی دکھائی دیتی ہو؟"

"جی ہاں، ہوم ورک پورا نہیں کیا تھا اس لئے ٹیچر نے
بینچ پر کھڑا کر دیا تھا"

شفیق بے حد سعادت مندی سے بولا

ابو کے ہاتھ سے نوالہ چھوٹتے چھوٹتے بچا۔
"ہائیں، تم اتنی بے پروا کب سے ہو گئیں بیٹی؟"
فوزیہ نے کچھ کہنے کو منہ کھولا ہی تھا کہ شفیق پھر بول پڑا۔
"اور ہاں جان، مجھ سے خواہ مخواہ الجھتی تھیں کہ انسان چاند پر پہنچنے والا ہے جبکہ میرا کہنا یہ تھا کہ چاند خود زمین پر موجود ہے"
ابو نے ہاتھ روک لیا
"ہائیں، چاند زمین پر کیسے موجود ہے، میں نے تو کسی اخبار میں ایسی خبر نہیں پڑھی"
ٹیلی فون کی گھنٹی نے بھرم رکھ لیا، شفیق اٹھ کر فون ریسیو کرنے دوڑا اور فوزی کو ہنسی روکتی دشوار ہو گئی۔

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا

شمالی دریچوں سے ہوائیں آ آ کر فوزی کو چھیڑ رہی تھیں۔ سونے کی طرح جھل مل کرتا اس کا رنگ سنہری ساڑی میں اور بھی لو دے اٹھتا تھا۔
آنکھوں میں شفاف شبنم کی طرح ٹھہرے ہوئے آنسوؤں کے قطرے!! ہوا جیسے پاسِ حسن سے جھک کر سہم گئی، فاختئی رنگ کے پردے ہلتے ہلتے ٹھہر گئے، بس ہوا اور فضا میں موتیا کی مہک رچی رہ گئی، موتیا، جس پر فوزی کی جان جاتی تھی۔
"میں مروں گی تو اپنی قبر پر موتیا کا پودا لگوانے کی وصیت

کر کے مروں گی۔" ایک دن وہ بڑے موڈ میں آ کر اپنی پسند کا اعلان کر رہی تھی۔

"اس حساب سے تو فوزیہ بی بی کی شادی موسم گرما میں کرنی چاہیئے!"

"کیوں بھلا؟"

رضیہ کو شادی اور موت کا تعلق کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔

"ارے بھئی گرمیوں میں موتیا کے پھول اپنی بہار پر ہوتے ہیں نا؟ ان کے دولہا میاں جبھی تو موتیا کا سہرا باندھ کر آ سکیں گے۔ ورنہ دوسرے موسم میں تو سڑے بسے پھولوں پر بات جائے گی۔"

فوزی کا منہ تب گیا "آپ عجیب آدمی ہیں۔ میں کیا کہہ رہی تھی اور آپ کیا ذکر لے بیٹھے!"

شفیق ہنسا

"ہاں یہ لڑکیاں اسی طرح بات گھما پھرا کر کہا کرتی ہیں۔ قبر سے آپ کا مطلب سچ مچ کی موت تھوڑا ہی تھا، وہ تو ہم جانتے ہیں۔"

فوزیہ بھنا گئی "آپ کا جواب نہیں حضور ـــــ جو جی میں آئے ہانکے جاتے ہیں۔"

اس کے سیم گوں چہرے کا رنگ دم بدم بدل رہا تھا۔ اور آنکھیں مارے غصے کے کبھی تو خاکستری نظر آنے لگتیں اور کبھی بھوری۔

پھر وہ اپنے شرارت بھرے چہرے کو اس کے چہرے
ے بہت قریب لاکر بولا ـــــ " مگر آپ یقین رکھئیے، کسی کو ہم
میں شادی ہو میں آپ کے گھر دولہا بن کر آؤں گا تو موتیا
ہی کا سہرا باندھ کر آؤں گا "

فوزیہ نے چہرہ اٹھا کر اسے غصہ سے گھورا،
" ہونہہ ، دولہا بن کر آئیں گے یہ ؟"
اس کی آنکھوں میں حقارت ہی حقارت بھری ہوئی تھی
شفیق اسے بھی محبت کا ایک انداز سمجھا۔

پھر اچانک یوں محسوس ہوا جیسے گھر میں برات اترگئی
ہو ، ہر طرف چہل پہل اور دھوم دھڑکا ، پھوپھی اماں
اپنے شفو کا پیام فوزیہ کے لئے لے کر آئی تھیں ،

فوزیہ جو سچ مچ چاند کی رشتہ دار تھی، بلیوں کی طرح سبز
آنکھیں ، جو لمحہ بہ لمحہ رنگ بدلتی تھیں ، سنہرا رنگ جو ہنسی
اور غصہ میں دمکنے لگتا تھا ۔ بھورے سنہری مائل گال
جن پر کبھی بھولے بسرے آنسو ٹھہر جاتے تو سچے موتیوں
کا شک ہوتا ۔

فوزی جو پیلے اور گہرے فیروزی رنگ کی خوب لمبی
سی امریکن کار میں کالج جاتی تھی اور پڑھتی تھی کہ انسان
چاند پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے
لیکن پتہ نہیں شفو نے کون سے کالج میں پڑھ لیا
تھا کہ زمین پر بھی ایک چاند ہے ، ورنہ اگر سچ مچ چاند

ہوتا تو سب سے پہلے شفق ہی اسے حاصل کرنے کے لئے لپک نہ پڑتا ؟

ابو نے جب گول مول باتوں میں پیام رد کر دیا تو ہر چند کہ انہوں نے اپنی امارت اور بہن کی غربت کا کوئی سوال نہ اٹھایا تھا، لیکن اس دن شفیق پر ساری دنیا تاریک ہو گئی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر سر جھکائے اپنے کمرے میں بیٹھا رہا ــــ ؛

دو ایک بار فوزیہ اُدھر سے آنکھوں میں خوشی دبائے گزری پھر بھی اس نے سر اٹھا کر نہ دیکھا، چاند دھیرے دھیرے اِدھر سے اُدھر ہو گیا۔ تارے ایک ایک کر کے غائب ہو گئے لیکن شفیق اسی طرح سرنگوں بیٹھا رہا۔

موتیے کے حسین اور خوشبو دار پھول جن کا نہ جانے کتنے دنوں سے اس نے سہرا گوندھ رکھا تھا، سارے کے سارے مرجھا مرجھا کر ٹوٹ گئے اور وہ یوں ہی بیٹھا رہا جب صبح کی پہلی کرن اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو اسے احساس ہوا کہ رات ڈھل چکی ہے، وہ اپنے اس خیال پر خود ہی مسکرایا لیکن یہ کیسی رات ڈھلی ہے کہ روشنی کا کوئی گزر ہی نہیں ؟

"تم خدا نہیں تھیں، لیکن خدا کی طرح مجھ سے قریب تھیں میں اکثر سوچتا تھا کہ تم اگر پاس ہو تو دنیا میں کوئی غم نہیں ہے، لیکن تم زندگی میں اس طرح آئیں جیسے رات کی خاموش اداس تنہائی میں پھول کی خوشبو جسے سینے اور دل میں چھپا کر رکھ لینے کا یارانہ ہو ــــــ بھلا خوشبو بھی کبھی

قید ہو سکی ہے ؟؟

لیکن تمہارا چلا جانا تمہارے آنے سے بھی زیادہ تکلیف دہ تھا۔ تم اس طرح چلی گئیں جیسے دھوپ دیکھتے دیکھتے غائب ہو جائے، جیسے روشنی ماند پڑ جائے۔ اجالا کھو جائے۔ میں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ تم جو کبھی ایک ہنسی کی طرح میرے ہونٹوں پر چھائی تھیں۔ آنسو بن کر میری آنکھوں، میرے دل سے نکل جاؤ گی۔ اب سوچتا ہوں واقعی تم خدا ہی کا ایک روپ تھیں، جو بظاہر بہت مہربان ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، لیکن دراصل کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ میں نے تمہیں دیا ہی کیا ہے جو تم سے کچھ مانگنے کا حوصلہ کروں۔ لیکن یہ میری خلوص بھری بددعا ہے کہ تمہارے کندن کی طرح دمکتے گالوں پر سدا سچے موتی جگمگاتے رہیں، اور یہ خلوص بھری بددعا بھی محض اس لئے ہے کہ ہو سکتا ہے اس طرح تم اپنے دل کی آگ ٹھنڈی کر سکو

میں یہ کیسے مان لوں کہ تمہارے دل میں میرے لئے کوئی آگ نہیں بھڑکے گی ؟ میں تمہارا دوست ہوں نا ؟ میں بھلا کب چاہوں گا کہ تم آگ میں جلتی رہو "

فوزیہ تیسری بار ادھر سے گزری تو شفیق کو پھاٹک سے نکلتے پایا۔

ایک لمحہ کو اس نے رُک کر فوزی کی طرف دیکھا تھا، صرف ایک لمحہ کو اور شاید وہی ایک لمحہ تھا جس میں ساری دنیا آنسوؤں سے بھیگ گئی تھی، بچے بازار سے شاپنگ کر کے

ابھی ابھی لوٹے تھے اور مسلسل ایک ہی ریکارڈ بجائے جا رہے تھے۔

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا

اور جب فوزیہ تیزی سے پلٹ کر اپنے کمرے کو جا رہی تھی تو ہوا نے اس کے قدم جکڑ لئے "تم خدا نہیں تھیں لیکن خدا کی طرح مجھ سے قریب تھیں۔"

فوزیہ نے آنسو بھری آنکھیں اٹھائیں "وقت گزر جاتا ہے لیکن یادیں جہاں کی تہاں رہتی ہیں۔ کیسے کیسے گھاؤ دل کو سہنے پڑتے ہیں۔"

وہ اٹھ کر دریچے کے قریب آئی، موتیا کے پھول ہواؤں کے ساتھ اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔ اس نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ روشن چاند کے قریب ہی ایک ستارہ چمک رہا تھا فوزی کو بھولی بسری یاد نے آ دبوچا۔

"یہ ستارہ ہے نا؛ سنتی کیوں نہیں؟ کام کی بات بتا رہا ہوں، یہ جو ستارہ ہے نا؟ جب چاند سے بالکل مل جائے گا، اس دن قیامت آجائے گی!"

"لیکن شفو بھیا؛ قیامت ہوتی کیسی ہے؟"

"قیامت؟ ارے تم نے قیامت نہیں دیکھی، پھر یہ اور کیا ہے؟"

شاہینہ نے پلٹ کر دیکھا، گہرے نیلے رنگ کی کریپ کی شلوار اور اسی رنگ کے کرتے اور اسی رنگ کے کرتے اور دوپٹہ میں ملبوس فوزی گلاب کی کلیاں چن رہی تھی، اس

نے حیران حیران نگاہوں سے دونوں کو دیکھا، شاہینہ ہنس کر بولی۔

"اری بجو! آپ نے سنا، شفو بھیا آپ کو قیامت کہتے ہیں ــــ"

فوزی کا چہرہ گہرا سنہری ہو گیا "تمہارے شفو بھیا تو جو جی میں آئے کہتے رہتے ہیں، وہ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ چاند زمین پر موجود ہے"

"تو کیا جھوٹ کہتا ہوں؟"

وہ جان بوجھ کر فوزیہ کے قریب آگیا

"آپ سے سچ کہنے کی امید ذرا کم ہی رہتی ہے"

"لیکن اللہ قسم ایک بات کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا"

وہ خالص فوزی کے لہجہ کی نقل کرتے ہوئے بولا

"وہ کیا ــــ؟" وہ ہنس کر بولی۔

"یہی کہ خاکسار آپ کا سچا عاشق ہے"

"بالکل تھرڈ کلاس عاشق ہے" فوزیہ منہ بنا کر بولی۔

"پچھتائیں گی، یاد کیجئے گا"

"آپ بھی کوئی بھلانے کی چیز ہیں؟" وہ ذرا طنز سے بولی تھی۔

اور اب وہ، وہی تو تھا جو رہ رہ کر یاد آرہا تھا، فوزیہ نے کب سوچا تھا کہ وہ ہنسی ہنسی میں جی ہار جائے گی، وہ کھلنڈرا سا لڑکا جو اپنے کمرے میں پڑھتے پڑھتے اچانک بچوں میں جا کر کودنے پھاندنے لگتا تھا۔ جو پڑھائی سے

بی چرا کر، آم کے درختوں پر چڑھ کر ناول پڑھا کرتا تھا۔ جو اکیلے میں بالکل فلموں کی طرح ڈائلاگ بولنے لگتا تھا۔ اچانک اس طرح اس کے ہوش و حواس پر چھا جائے گا کہ اس کی یاد کے ساتھ ہی آنسو نکل آیا کریں گے۔

"میں تمہاری طرح اتنا خوبصورت ہوتا کہ آنکھوں کے پانی پر موتیوں کا دھوکا ہوتا تو خدا کی قسم موتیوں کی دکان کھول لیتا۔"

لیکن اب اس کی بلوریں آنکھوں میں کتنے ہی موتی چھپے تھے کہ وہ چاہتا تو ان کا سہرا گوندھ سکتا تھا۔ لیکن وہ موتی سمیٹنے والا کہاں تھا؟

پتہ نہیں کیسے اسے علم ہو گیا کہ ماموں جان نے پیام صرف غربت کی وجہ سے ٹھکرا دیا۔ بس وہ دن اور آج کا دن ——— اس کی کسی کو خبر نہ ملی کہ کہاں چلا گیا۔

دور دیس کو چلے جانے والے کبھی یہ نہیں سوچتے کہ درد کی سوغات سنبھالنا کتنا کٹھن ہوتا ہے، اس نے کھڑکی میں کھڑے کھڑے نیلے آسمان کو تکتے ہوئے انتہائی دکھ کے ساتھ سوچا۔

پھر ایک ایک کر کے سب موسم آئے اور چلے گئے۔ وہ جان لیوا موسم بھی گزر گیا۔ جب شام کو بادل جھومتے تو ملگجا ملگجا اندھیرا چھا جاتا۔ اور کسی نہ کسی کونے سے نکل کر وہ سرگوشی میں پوچھتا۔

"میں نے کہا فوزیہ بی بی! آپ نے کہیں اپنی زلفیں

تو نہیں کھول دی ہیں جو فضاؤں میں ایسا اندھیرا رچ ، گیا ہے "

چھم چھم منہ برساتی سہ پہریوں کو وہ کسی آم کی شاخ سے کود کر کپڑے نچوڑتا ہوا اس کے قریب آتا۔

" شکر ہے آپ پھلی جنگی ہیں ، ورنہ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ یہ موتیوں کی برسات کہیں آپ کی حسین آنکھوں کا فیضِ عام تو نہیں ! "

اور پھر جاتی سردیاں اور آتی گرمیاں ، ہائے وہ یادوں سے بوجھل موسم ، موتیا کی ادھ کھلی کلیوں سے جب ساری فضائیں مہک جاتیں ، اندھیروں میں تاروں کی طرح چمکتے ہوئے گول گول پھول جھومتے۔

تب کیسے کیسے اسے اس غیر اہم سے لڑکے کی یاد ستانے لگتی جو کبھی اس کے لئے کوئی حقیقت نہ رکھتا تھا۔ اور پھر بھی سب کچھ تھا۔ وہ کیسے اسے بھولے گی : کیسے اپنے دل کو تھامے گی۔

شادی کے ہنگامے اپنے عروج پر آجائیں گے اور سارے گھر میں دھوم دھڑکا ہو جائیگا۔ اس وقت اس کا اپنا دل کتنا ویران ہوگا وہ کیسے زندہ رہے گی ؟

ابو کتنے خوش ہیں بارہ سو روپے ہوتے بھی تو بہت ہیں ، جبکہ ان کے ساتھ ایک بنگلہ اور گہرے ہرے رنگ کی پلے متھ کار بھی ہو ، لیکن کبھی کبھی ایسا سوچنا بھی تو خوشگوار معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹا سا ایک گھر ہو ، جسمیں گیرج ہو نہ ، صوفے ، نہ بھاری بھرکم پردے ہوں نہ پیانو ، بس ایک

شفیق سا چہرہ ہو محبت کرنے والا ؛

جو بچوں کی آنکھ بچا کر اندھیرے اُجالے، کونے کھدرے کندھوں سے پکڑ لے، اور اپنی گرم گرم سانسوں کا شہد کانوں میں گھولتے ہوئے بولے۔

"اللہ قسم تم تو پوری قیامت ہو!"

اس نے اپنے تپتے ہوئے چہرے پر ہاتھ پھیرا، چمکتے آنسو، پانی کا روپ دھار کر اس کے ہاتھ کو بھگو گئے۔ کھلا کھلا آسمان جو شفو کی یاد دلاتے تھے پیلے اور سوکھے پتے اِدھر اُدھر اڑتے پھر رہے تھے، اس کا دل بھی اپنی جگہ پر نہ تھا۔ اندر شاہنہ بے سری تانوں کے ساتھ الاپ رہی تھی۔

پتہ ٹوٹا ڈال سے لے گئی پون اڑائے
اب کے بچھڑے کب ملیں دُور پڑیں جا جانے

وہ کھڑکی میں بیٹھے بیٹھے بہت دیر تک ان درد بھرے بولوں کو دہراتے ہوئے گنگناتی رہی۔

پتہ ٹوٹا ڈال سے.....
پتہ ٹوٹا ڈال سے.....

اور پھر یہ سب کچھ ایسے ہوا جیسے خواب میں ہوتا ہے۔ وہ اس رات آم کے مضبوط تنے سے لگی کھوئی کھوئی تھی کہ کسی کی گیلی گیلی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"میں یہاں ہر چیز چھوڑ گیا۔ سوچا صرف ایک ہی چیز کیوں ساتھ لیتا جاؤں؟ آج واپس کرنے آیا ہوں، اپنی امانت سنبھال لو"

اس نے اپنا مضبوط ہاتھ سامنے کر دیا۔

اس نے پھٹی پھٹی حیران آنکھوں سے اسے دیکھا، یہ کون تھا جو اسے الاہنے دینے آیا تھا، یہ کون تھا جو اس کی زندگی کا درد سمیٹنے آیا تھا۔ اس کے ہونٹ کومل کومل ننھی پتیوں کی طرح کانپے۔

"لیکن تم ایک امانت لوٹا بھی دو گے تو وہ سب کچھ کیسے لوٹا دو گے جو میں اب تک تمہارے....."

آواز اس کے گلے میں گھٹ کر رہ گئی۔

شفو حیران سا اس کے قریب آ کر بولا۔

"فوزی! میں جان کر تمہیں دکھ دینے نہیں آیا، راستے میں تمہارا شہر پڑتا تھا، سوچا وہ درد کی سوغات دیتا چلوں...

جس نے چار برسوں میں کبھی ایک لمحے کو بھی مسکرانے کا موقع نہیں دیا...

یہ تمہاری وہ تصویر ہے جو میں نے باغیچہ میں کھینچی تھی..... تم بنا کر اپنی سیاہ زلفوں کو جھٹکا رہی تھیں۔

وہ جھک کر بولا

"شفیق اب وہی سیاہی میرا مقدر بن گئی ہے"

وہ روہانسی آواز میں بولی۔

وہ ذرا الجھ کر بولا

"تم نے..... خود اندھیروں کو گود لیا ہے..... شکایت کیوں کرتی ہو اب؟"

وہ قدرے رکا ــــ، پھر سر اٹھا کر آسمان کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"ان بادلوں کا بھی کوئی بھروسہ نہیں، نہ جانے کب اور کہاں برس پڑیں، تو میں چلوں؟"

اس کے ساتھ ہی فوزیہ نے بھی سر اٹھا کے آسمان کو دیکھا۔

اس کے چہرے پر نور سا چھا گیا ـــــ قدرے مسکرا کر بولی۔

"شفو!.....

"ایک بار تم نے کہا تھا نا کہ جب یہ ستارہ چاند سے بالکل مل جائے گا تو قیامت آجائے گی!"

شفو نے حیران حیران نگاہوں سے اسے دیکھا اور کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ ـــ،

فوزیہ تیزی سے آگے بڑھی۔ اور اپنی ساڑی کے آنچل سے اس کی راہ روکتی ہوئی بولی۔

"میں خدا نہیں ہوں اور نہ خدا ہو کر تمہاری آنکھوں سے اوجھل رہنا چاہتی ہوں!.....

کیا تم بھی اس بات سے خوش نہیں ہو شفو کہ ہم محض انسان ہیں..... جو!

ایک دوسرے کو نہ صرف دیکھ سکتے ہیں بلکہ چھو بھی سکتے ہیں؟"

شفو نے حیران ہو کر پہلے فوزیہ کو پھر آسمان کو دیکھا....،

جہاں چاند اور ستارے کو ایک بدلی نے اپنے اپنے دامن میں سمیٹ لیا تھا۔

چھنال

"رنڈی اور چیچک نکلے بغیر نہیں رہتے ـــــ میں تو پہلے ہی کہتی تھی ـــــ"

اماں بی نے دھڑاکے سے پاندان بند کیا، زور سے، پانوں کی ٹوکری لڑھکائی۔ اور صابر میاں کی طرف کھا جانے والی نظروں سے دیکھا، جو دونوں ہاتھوں میں سر تھامے، غم اور ندامت کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔

"مونڈی کٹی، کوٹھے کی چھنال آخر چھنال ہی نکلی نا ـــــ ارے کوئی کمرے کی خبر تو لو ـــــ کہیں زر زیور پر ہاتھ صاف کر کے تو نہیں نکل گئی اپنے کسی دھگڑے کے ساتھ ...

"اماں ـــــ"

زہرہ نے کچھ کہنا چاہا مگر لب نہ کھل سکے۔

صابر میاں کو کوئی چھرے سے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتا تو بھی شاید ہی قطرہ بھر خون نکل پاتا ـــــ کیسی بد ہوئی تھی !! کیسے بڑے بڑے دعدے، اور کیسی کیسی تعریفیں اماں کے سامنے کی تھیں اور اب ـــــ ؟

خالی کمرہ اُن کا منہ چڑا رہا تھا ـــــ

رنڈی کو گھر بٹھا لینا کوئی معمولی بات ہے بھی نہیں۔ بڑے بڑوں سے سنتے آئے ہیں، لاکھوں کا گھر خاک کرنے والی کیا کسی کے گھر کو جائے گی۔

لیکن صابر میاں کا دل آیا بھی تو کس پر دو ٹکے کی کوٹھے والی پر ــــ! گانا سننے ناچ مجرے دیکھنے تو ہزاروں ہی دل والے کوٹھوں پر جاتے ہیں، لیکن یوں کوئی دل نہیں ہارتا ــــ اور یہ بے چارے پہلے تو کبھی کوٹھے پر گئے بھی نہیں تھے ــــ؛

بس اپنے ایک دوست کی شادی میں ہی تو گئے تھے۔ وہاں آگرہ کی کسی گوہر جان کا مجرہ بھی ہونے والا تھا۔ آج کل تو موافیشن ہی چل نکلا ہے کہ شادی بیاہ میں رنڈیاں نچواتے ہیں ــــ مجرے کرواتے ہیں ــــ اور اچھے اچھے شریفوں میں یہ سب ہو رہا ہے اور لوگ برا مانتے بھی نہیں ہیں یہ تو بڑے پن کی دلیل مانی جاتی ہے۔ جس شادی بیاہ کی محفل میں سلیقے سے چنے گئے گدّوں پر سفید سفید چاندنیوں، کامدار مسندوں اور جگمگاتے گاؤ تکیوں کے سہارے بیٹھی ہوئی "بیگمات" اپنے گلے کے سُر نہ جگائیں اور گھنگھرو نہ چھنکائیں وہ محفل ہی کیا ہوئی ــــ

گوہر جان کو دیکھا تو صابر میاں کا دل اپنی جگہ چھوڑ بیٹھا۔ ــــ لوگوں نے دیکھا نہ محسوس کیا، یہ تو دل بہلا دے کی چیزیں ہیں ــــ کوئی یوں جی تھوڑے ہی ہار بیٹھتا ہے مگر وہ اپنے جگری دوست انور سے دل پکڑ پکڑ کر کہہ رہے تھے ــــ

"یار اس آگرہ والی نے دل میں گھر ڈال دی ہے ــــ"

پھر انور کے ساتھ ایک بار اس کے کوٹھے پر گئے وہی مخصوص ماحول جس کے بارے میں قصہ کہانیوں میں پڑھا تھا، وہی بائی جی ــــ وہی استاد جی ــــ وہی سازندے ــــ وہی فرش فروش، وہی گاؤ تکیے، چاندنیاں اور اس پر بیٹھی ہوئی روایتی طوائف ــــ لیکن اللہ جانے کیا بات تھی کم بخت میں، دلبری کے سارے انداز ختم تھے اس پر ــــ

ایک نگاہِ غلط انداز سے انہیں دیکھا اور اپنے دوسرے چاہنے والوں کی طرف متوجہ ہو گئی ــــ جیسے کہتی ہو ــــ،

"اور مرد ہم پہ ــــ لیکن ہمیں تمہاری کب پروا ہے؟"

سامنے ہی سنار زیورات کے ڈھیر سارے ڈبے کھولے بیٹھا تھا ــــ بیگماتی انداز سے ایک ایک زیور کو دیکھتی اور "اونہہ" کہہ کر پرے رکھتی جاتی ــــ پنے جڑی ایک انگوٹھی کو ذرا غور سے دیکھا تو بائی جی جھٹ پکے پن سے بولی ــــ

"بیٹی انگوٹھی انگوٹھی کر کے میری جان کھائے جا رہی تھی اب پسند آ گئی ہے تو لے کیوں نہیں لیتی ــــ" اور بائی جی نے سامنے بیٹھے ہوئے اکبر سیٹھ کی طرف لگاوٹ سے دیکھا۔

"ارے لے بھی لو ــــ"

اکبر سیٹھ لاپرواہی سے خوش دلی کے ساتھ بولے۔
"ان انگلیوں میں تو پتے اور ہیرے کی انگوٹھیاں ہی سجتی ہیں —"

"میری اتنی باط کہاں —؟" وہ بناوٹی بھولپن سے بولی۔

"ارے میری جان — ہزار بارہ ہزار کی انگوٹھی میں تمہاری باط کہاں سے آکر اٹک گئی — پسند تو کرلو —"

سنار نے چودہ ہزار اور گیارہ ہزار کی دو انگوٹھیاں دمکتی انگلیوں میں پہنا کر دیکھیں، بالکل برابر تھیں، اکبر سیٹھ نے اپنی دکان کا کارڈ نکال کر سنار کے آگے کو پھینکا — "دکان سے روپیہ اٹھا لینا — ہمارا نام بتا دینا —"

ابھی چاندی کے پنجے سے جس میں دو جگہ سگر کرتی، انگوٹھیاں دمک رہی تھیں، اس نے حاضرین کو جھک جھک کر آداب کیا اور صابر میاں وہیں ڈھیر ہو گئے۔

"کہاں وہ اور کہاں تم — میاں کوئی اور دوسری، جو کھٹ دیکھو —"

ان کے دل نے انہیں سمجھایا، مگر دل اب ان کے قابو میں تھا ہی کب — اور ایسے کتنے دل تلوؤں تلے بچھے پڑے تھے۔

انور نے ایک دن انہیں بیٹھ کر سمجھایا۔

"مارے میاں یہ رنڈیاں صرف پیسہ بٹورنے کے لئے ہوتی ہیں، انہیں کسی سے محبت نہیں ہوتی، صرف پیسہ ہی ان کا مذہب ہوتا ہے ۔۔۔ تم کہاں اس کے چکر میں پڑ رہے ہو ۔۔۔ تم دیکھتے نہیں سبھی کی طرف وہ اسی محبت بھرے انداز سے دیکھتی ہے جسے تم اپنے لئے مخصوص سمجھ رہے ہو ۔۔۔"

لیکن صابر میاں اس کی اس دن کی حیا اور ایک نگاہ کو بھول نہ پاتے تھے۔

اس دن وہ اکیلے ہی اس کے کوٹھے پر چلے گئے تھے ۔۔۔ ابھی لوگوں کی آمد شروع نہیں ہوئی تھی۔ یہ پہلے تھے، کامدار مسند پر بڑی بیٹھی ہوئی تھی، یہ پاگلوں کی طرح بڑھے، مسند سے ذرا ہٹ کر اس کی گہرے سرخ رنگ کی کارچوبی کام کی چڑھالوں میں پاپوشیں پڑی ہوئی تھیں۔

انھوں نے بے تابی سے اپنے جوتے اتارے ایک جوتا، تڑپتا ہوا اٹھا اور جوتی پر اوندھا جا پڑا۔ انہوں نے جوتے کو ایک نظر دیکھا اور بڑی تڑپ سے بوسے لیے۔

"کس قدر خوش نصیب جوتا ہے!"

گوہر جان نے ایک نظر وہ منظر دیکھا اور شرم سے تپ گئی ۔۔۔ منہ پھیر کر بولی۔

"بڑے بے ہودہ ہیں جی آپ ۔۔۔"

مارے حیا کے اس کی آنکھیں اٹھ نہیں پا رہی تھیں۔

یہ انداز تو صابر میاں کو بالکل ہی مار گیا ۔۔۔ شرم تو

صرف شریف عورتوں کا زیور ہے ـــــ یہ بھی شریف عورت ہے اور خاندانی اور حیادالی ـــ لوگ یونہی بکتے ہیں، وہ ادبدا کر اس کے قریب گھس بیٹھے۔

"قسم خدا کی ـــ مت آزماؤ! مت آزماؤ ـــ چین نہ پاؤ گی ـــ بن موت مرجاؤں گا ـــ"

"جو دل نہیں کہتا وہ زبان سے کیوں کہتے ہیں آپ؟ کیا واقعی شیطان کے کان بہرے، حضور مرجائیں گے۔"

اس انداز پر تو وہ اور بھی فدا ہو گئے تڑپ کر بولے "کیا ابھی زندہ نظر آتا ہوں ـــ؟"

وہ ایک ایسی ہنسی ہنسی جو اگر آسمان سے گرے تو ہری بھری کھیتیوں تک کو جلا کر راکھ کر دے ـــ

وہ تڑپ کر بولے ـــ "ہنستی ہو ـــ کیا جھوٹا نظر آتا ہوں تمہیں ـــ"

وہ مسکرائی ـــ "اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھئے"

وہ بہرحال مروتے، شرارت، پر اتر آئے ـــ ہنس کر بولے ـــ "تم اپنے گریبان میں منہ ڈالنے دو تو ایک بات بھی ہے، چاند سورج کے نظارے ہی ہو جائیں گے ـــ میرے گریبان میں کیا دھرا ہے ـــ"

اس نے شرم سے تڑپ کر اپنے دونوں گورے گورے ہاتھوں میں چہرے کا چاند چھپالیا ـــ

"اللہ ـــ کتنے بے حیا ہیں آپ ـــ یوں بھی کوئی کہتا ہے ـــ"

بس یہ شرم ان کی دنیا لوٹ لے گئی۔ بے شرمی نے
اس اتنے گھر نہیں اُجاڑے جتنے اس نامراد شرم نے
وہ بس انور کو ہر مرکہ یہی سنائے جاتے تھے ـــ

" نہیں یار تمہیں پتہ نہیں وہ بڑی شرم و حیا والی،
گھریلو بی بی بن کر رہنے والی عورت ہے، پتہ نہیں کیسے
اس جنجال میں پھنس گئی ـــ "

" مرد جب خود کسی جنجال میں پھنسنے والا ہوتا ہے تو
اسی طرح کی باتیں کرتا ہے ـــ "

انور بیزار ہوکر بولا۔ مگر وہاں تو بس ایک ہی رٹ
لگی ہوئی تھی ـــ۔

دو یا تین ملاقاتیں زندگی کی مول بن کر رہ گئیں، لیکن
آخری ملاقات میں تو وہ بالکل ہی پاگل بن بیٹھے ـــ
کسی رئیس دوست کے ہاں سالانہ محفل جمتی تھی جس
میں ہر بار کسی نہ کسی چلت پھرت والی طوائف کو بلایا جاتا تھا۔
اب کے بار قرعۂ فال گوہر جان کے نام پڑا ـــ رات بھر کی
محفل تھی ـــ صابر میاں کیسے چوکتے ـــ بنا پلک مارے،
سب کے سامنے والی قطار میں بیٹھے، رات بھر اسے نہارتے
رہنے ـ

ادھر موذّن اذان کے لئے منبر پر چڑھا اور ادھر گوہر
جان نے ہارمونیم بڑھایا ـــ رات بھر کے تھکے ماندے،
کوئی اپنے گھر سدھارا اور کوئی وہیں پڑا رہا۔
سازندے ہاتھ پاؤں سیدھے کرنے لگے ـــ جس کو

جہاں جگہ ملی وہیں پڑ رہا ـــــ موٹے موٹے گدیلوں پر سفید سفید چاندنیاں لگی ہوئی تھیں۔ تکئے قرینے سے، دھرے ہوئے تھے ـــــ

مہاوٹیں برس رہی تھیں، تکان اس پر سے رات بھر کی جگار ـــــ آنکھوں میں نیند اتر آئی تھی صابر میاں کو جگہ بھی ملی تو گوہر جان کے قدموں میں ـــــ جنے کتنی راتوں کے جگے ہوئے تھے کہ محبوب دلنواز کے قدموں میں جگہ پاتے ہی بے سدھ ہو گئے۔

آنکھ کھلی تو کاہے سے کھلی کہ کسی کے ٹھنڈے ملائم ہاتھ ان کے پیروں کو چھو رہے تھے ـــــ جیسے جنموں کی نیند سے آنکھ اچٹ گئی ـــــ کانوں میں شہد سا برس رہا تھا۔

"ہائے ایسے بھی کوئی نہ سوئے ـــــ ململ کے نامراد کرتے میں جان کیا کہہ رہی ہوگی ـــــ اوپر سے پیروں میں پاتابے بھی نہیں ـــــ اور انہوں نے خود دیکھا تھا کہ پیروں کو ہاتھوں سے چھو کر اس نے اپنے دوپٹے کو ان کے پیروں کے گرد مڑھ دیا تھا ـــــ کہ پیر ذرا گرم ہو جائیں ـــــ

"یہ ادا ـــــ یہ خدمت گذاری اور ہمدردی کی ادا تو صرف ایک پتی ورتا، گھریلو اور محبت والی بیوی ہی میں ہو سکتی ہے ـــــ"

انھوں نے اپنے ہزار تردید کرنے والے دل کو سمجھایا

تھا ___ اور پتہ نہیں یہ اُن کے اپنے تڑپتے دل کا اثر تھا یا گوہر جان کو کبھی صابر میاں پسند آ گئے تھے، کہ وہ کوٹھے سے اترنے پر راضی ہو گئی ___

یہ الگ داستان ہے کہ وہ کس طرح اپنی ماں کو منا پائے (جو سید زادی تھیں) ___ سید صاحب کی بیوی تھیں اور پنج وقتہ نمازی تھیں اور اعتکاف میں بیٹھتی تھیں اور مریمی روزے رکھتی تھیں ___ شاید مذہب سے حد درجہ بڑھا ہوا لگاؤ ہی تھا جو انہیں وہ زیر کر سکے ___ کہ

"اماں گنہ گار جب توبہ کرلے تو خدا کے نزدیک وہ اتنا ہی معصوم اور مقدس بن جاتا ہے جتنا کہ ابھی ابھی پیدا ہونے والا بچہ ___ اور اماں یہ تو سوچئے کہ وہ جوانی ہے مگر وہ اور گھناؤنی زندگی چھوڑ دینے پر آمادہ ہوئی ہے تو خدا نے ہی اسے راستہ دکھایا ہوگا نا ___ ؟ تو جسے خدا راستہ دکھا رہا ہے اسے آپ کیوں گمراہ کئے دیتی ہیں ___ ؟"

"ارے بیٹا ___ جو پاؤں ایک بار مجرے کے لئے کھڑے ہو چکے ہوں وہ کبھی کسی گھر میں نہیں ٹک سکتے ___ ہزاروں کامنہ دیکھی ہوئی عورت ایک مرد سے مطمئن نہیں ہو سکتی تم الغرض یا نہ مانو ___ ان آنکھوں نے تو یہی دکھایا ہے کہ رنڈی اور چیک نکلے بغیر نہیں رہتے لاکھ روکنے کی کوشش کرو ___"

لیکن اکلوتے بیٹے کی آہ وزاری کام آئی ___ اور اماں بی کا تھا ہی کون ___؟ لے دے کے ایک بیٹا اور ایک بیٹی.

میاں تو مدت ہوئی اللہ کو عزیز ہو چکے تھے۔
بیٹی تھی اس کی بھی منگنی ہو چکی تھی، آج نہ کل اپنے گھر جانے ہی والی تھی اور بیاہی بیٹی آئی بھی تو چند روز کے لئے ۔۔۔ اس کا ساتھ ہی کیا ۔۔۔ سیوٹ تو بیٹے سے ہی بھتی ہے اور اپنے جان کے ٹکڑے لاڈلے بیٹے سے بگاڑ کر کے رہتیں بھی کیسے ۔۔۔ ؟ اور جو کبھی اکتا کر زہر وہر ہی کھا لیتا تو کہاں کی رہتیں ۔؟

گوہر جان دلہن بیگم بن کر گھر میں آگئیں ۔۔۔ زہرہ نے تو بھابی، بھابی کر کے ہاتھوں لیا، لیکن اماں بی نے بازو کے کمرے سے اتنی زور سے بیٹی کو سنایا "رنڈی اور چھچک نکلے بغیر نہیں رہتیں ۔۔۔ دیکھ لینا صابر میاں کی ناک کٹا کے ایک دن نکل بھاگے گی ۔۔۔"

کہ دلہن بیگم کا ننھا سا دل چور چور ہو گیا۔

زہرہ بولی۔

"اماں خدا کے لئے ایسا نہ کہیئے، بھابی کو دکھ ہوگا اگر سن لیا تو ۔۔۔"

اماں بی غصّہ سے بولیں۔

"اے شریف زادی کو شریف زادی کہینگے تو رنڈی کو بلاشبہ رنڈی کہیں گے، اس میں دکھ کی کون سی بات ہوئی ۔۔۔"

کوٹھے پر یلی بڑھی۔ ہزاروں کے مجمع میں رہی بسی، تلوؤں تلے لاکھوں دل کچلنے والی کی پہلی صبح بڑی

عجیب و غریب، نکلی ــــ
صبح ہی صبح چھ بجے سے اماں بی کے وضو کرنے،
کھانسنے، پھر نماز کے بعد تلاوت کرنے کی آوازیں ــــ
پھر زہرہ کے وضو نماز تلاوت کی گنگناہٹ ــــ
"اللہ میں بیاہ کر سسرال آئی ہوں یا کسی مسجد
میں آ گئی ہوں ــــ "، اس نے گھبرا کر سوچا ــــ لیکن
پھر توبہ توبہ کر کے خود ہی برے خیالات کو ذہن سے جھٹک
دیا ــــ بازو دیکھا تو صابر میاں جو رات بھر "شراب ناب"
کے غٹاغٹ پیالے چڑھاتے رہے تھے بے سدھ سوئے
ہوئے تھے۔
" اٹھیئے حضور....... اس نے کندھا پکڑ کر ہلایا ــــ
پھر وہ خود ہی چونک اٹھی
" نہیں ــــ یہ قبلہ اور حضور جیسے الفاظ کو ٹھے کے
لغات میں تھے، اب مجھے شریف اور گھریلو عورت کی طرح
" اے جی ــــ سنیئے تو ــــ "، کہنا چاہیئے ــــ "،
اس نے دوبارہ سے انہیں ہلایا
" اجی سنیئے تو ــــ کب تک سوتے رہیں گے ــــ
کام وام پر جانا ہے یا نہیں ــــ "
انہوں نے چند ھیائی ہوئی آنکھیں کھول کر اسے دیکھا
اور شرارت سے اسے اپنے بھاری جسم تلے دبوچ لیا ــــ
" آہاں کام ــــ اس سے زیادہ ضروری کام کون سا
ہو سکتا ہے بھلا ــــ ؟؟ "

پہلا ہی دن سعیتوں کا دعوت نامہ لے کر آیا ـــ وہ اور زہرہ نہا کر بال سکھانے چھت پر نکلیں تو سامنے کے بنگلے والا اپنی چھت پر کرسی ڈال کر کوئی کتاب پڑھتا بیٹھا تھا ـ دلہن بیگم کو کمرہ اوپری منزل پر ملا تھا ـــ اور کمرہ اس ڈھب کا تھا کہ بے حد شاندار کمرے سے ملی ہوئی سنگ مرمر کی چھت ـــ

لگی ہوئی تھی، بیچ میں مونڈھے اور صوفے پڑے تھے اور ساتھ ہی ایک بڑی میز بھی چائے پانی رکھنے کے لئے رکھی ہوئی تھی ـ

منڈیروں پر خوب صورت پھولوں اور ننھے ننھے پودوں والے گملے سجے ہوئے تھے ـــ صابر میاں خوشحال آدمی تھے، شہر میں بڑا کاروبار تھا ـــ ذاتی دو منزلہ بنگلہ تھا، کسی چیز کی کمی نہ تھی ـــ

کنوارپن سے ہی وہ اوپری منزل پر رہتے تھے، چھت بھی انہی کے استعمال میں تھی ـــ شادی ہوئی تو ظاہر ہے کہ دلہن بیگم بھی وہیں رہیں ـــ

سامنے والا شاید کسی مجرے میں گوہر جان کو دیکھ چکا تھا ـــ پہلے تو اس نے اچٹتی نظر سے دیکھا، پھر صورت شناسا تھی تو ذرا غور سے دیکھا ـــ پھر پوری طرح پہچان کر ذرا ہنس کر دیکھا اور پھر ایک ہلکی سی سیٹی بجانے لگا ـــ؛

دلہن بیگم نے سیٹی کی آواز سن کر سر اٹھایا تو وہ ہنس کر میٹھے پن سے بولا ـ

"یہ میری جان ایسی بھی کیا بات ہے ـــ بنا کر اس چھت

پر بال سکھا رہی ہو ـــ پیسہ اور جوانی تو ہمارے پاس بھی فراغت سے ہے، ہمارے نصیب کیوں نہ کھولے ـــ"

زہرہ نے بھابی کو ذرا گھبرا کر دیکھا جس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں ـــ اک دم دلہن بیگم نے زہرہ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور بولیں۔

"بی بی اب سے یہاں نہیں آئینگے ہم ـــ اچھے لوگ نہیں ہیں اس بنگلے کے ـــ"

اس آدمی نے جو دونوں کو جاتا دیکھا تو ذرا زور سے بولا ـــ،

"ارے تم تو مسلی کچلی تھیں، ذرا اس منہ بند کلی سے تو میل کرا دو رانی ـــ"

یہ اشارہ صاف زہرہ کے لئے تھا۔

دلہن بیگم کو پسینہ آگیا ـــ آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا ـــ کمرے میں آتے ہی دھپ سے مسہری پہ گر پڑیں سسکیوں سے بدن ہلنے لگا

"بی بی ـــ میں تم جیسے شریف لوگوں کے لائق نہ تھی..... میری وجہ سے تمہاری زندگی...."

"بھابی ـــ"

زہرہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"آپ بیکار کی باتیں کیوں سوچ رہی ہیں ـــ یہ سامنے کے بنگلے والے تو یونہی بے کار سے لوگ ہیں اس لئے تو ہمارا اُن سے کوئی میل جول نہیں ہے ورنہ پڑوسی تو رشتہ داروں سے بڑھ کر ہوتے ہیں، بھائی جان نے شروع ہی

سے ان لوگوں سے تعلقات نہیں بڑھائے، اسی اوچھے پن کی وجہ سے ــــ آپ اپنا دل کیوں برا کرتی ہیں ــ "

"نہیں بی بی ؛ تم نہیں سمجھو گی ــــ میری رسوائی اگر میرا پیچھا نہ بھی کرے تو میری بدنصیبی میرا پتہ ڈھونڈھ لے گی ــ پھر میں کہاں چھپوں گی ؟"

"بھابی آپ چپ کر جایئے خدا کے لئے ورنہ میں بھی رونے لگوں گی ــ"

مگر دلہن بیگم کے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے ــــ

چند روز اور گذرے ــ ایسی کڑھن اور کلفت میں گذرے کہ جس کی حد تھی نہ حساب ــ،

میاں تو داری نیاری تھے مگر اماں بی چپ رہتے ہوئے بھی ہزار بول بول جاتیں ــ

کھانا کبھی انہوں نے اس ٹیبل پر نہ کھایا جس پر دلہن بیگم بیٹھتی تھیں ــ زہرہ کالج چلی جاتی ــ ورنہ اسی سے ذرا دلبستگی رہتی ــ

میاں کو ٹھیل ٹھیل کر یہ خود کام سے باہر بھیج دیتیں کہ جب تک وہ ــ اور یہ کمرے میں رہتے اماں بی کی غیر محسوس نگاہیں کلیجہ چھید ے ڈالتیں ــ

کئی بار جی میں آیا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں بھی چل دیں لیکن ایک بار گناہ کی جس دلدل کو پھلانگ آئی تھیں اب ادھر کا رخ کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہ سکتیں

تھیں ــــ،

زہرہ کالج سے آ کر اوپر چلی آتی تو اماں بی کے بکھان شروع ہو جاتے ــــ

"اپنی تو زندگی کو برباد کر ہی ڈالی بہن کا ہی کچھ خیال کیا ہوتا ــــ جب دیکھو تب منہ سے منہ لگا ہوا ہے پہلے تو میں چھت پر پھٹکنے بھی نہ دیتی تھی، اب تو جب دیکھو تب بھاوج ہیں نند ہیں اور بس چھت ہے ــــ"

دلہن بیگم حیران ہو کر سوچتیں کہ "اللہ زہرہ تو کبھی میرے پاس ہوتی بھی نہیں ــــ پھر یہ الزام کیسا ہے ــــ؟"

لیکن ایک دن چھوٹے سے دلہن بیگم کے جو دہ طبق روشن ہو گئے، بڑی عجیب اور انہونی سی بات تھی لیکن اس دن زہرہ مغرب کے وقت آئی تو ذرا گھبرائی ہوئی سی تھی ــــ دلہن بیگم سے لپٹ کر بولی ــــ

"اچھی بھابی میری ــــ اپنی کالے ہرے پھولوں والی ساڑی پہننے کو دیں گی آج ــــ"

"اے لو ــــ" وہ ہنس کر بولیں ــــ "یہ پوچھنے کی کون ضرورت آن پڑی ــــ بھابی کی چیز نند کی نہ ہو گی ــــ!! لے جاؤ اور جو جی چاہے شوق سے لے لیا کرو ــــ"

دو بجے کے کھانے پر صابر میاں بول گئے تھے کہ رات دیر سے آئیں گے کوئی میٹنگ تھی ــــ سب نے کھانا کھا لیا تھا ــــ دلہن بیگم میاں کے لئے بھوکی تھیں ــــ گرمی ہو رہی تھی وہ چھت پر نکل آئیں۔

اک دم انہیں فضا میں کچھ نامانوسیت کا احساس ہوا۔ وہیں ٹھٹک گئیں ۔۔۔ پچھواڑے کی چھت پر پانی کی ٹنکیوں کے پیچھے سے سرگوشی کی سی آواز ابھری ۔۔۔؛

"ہمت کیسے کی آج ۔"

"بھائی جان نے کہا تھا دیر سے آئیں گے ۔"

"اور جو آ گئے ۔۔۔ تو ۔۔۔" ساتھ میں بوسے کی آواز؛

"اتنی بے وقوف نہ سمجھو ۔۔۔ اسی لئے بھابی کی ساڑی پہن کر آئی ہوں کہ جھپک لپک میں اماں یا بھائی جان دیکھ بھی لیں تو سمجھیں کہ بھابی تھیں ۔۔۔ ان کے طواف ہونے کا ایک فائدہ ہمیں بھی تو ملا ۔۔۔ ..." ملی جلی ہنسی کی دبی دبی آوازیں سن کر دلہن بیگم کا خون ان کی رگوں میں جمنے لگا۔ آوازیں پھر سے ابھریں ۔۔۔

"لیکن میں تو اب ترس گیا ہوں ۔۔۔ صرف بوسوں سے اور یہ لپٹا لپٹی سے میری سیری نہیں ہوتی ۔۔۔ کوئی موقعہ ۔؟"

"بھابی کی ساڑیوں کی عنایت سے مل ہی جائے گا ۔۔۔"

ہنسی کی پراسرار آواز ابھری ۔

"دیکھو ٹال تو نہیں رہی ہو ۔۔۔"

"ٹالوں گی کیوں ۔۔۔ کیا وہی میرے دل کی آرزو نہیں ہے ؟"

"اچھا ہوا تمہارے بھائی ایک رنڈی کو بیاہ کر لائے ۔۔۔ اس کی آڑ میں تو ہم کافی دنوں رنگ رلیاں منا سکے

ہیں ـــ کم سے کم تمہاری شادی تک ـــ
دلہن بیگم سے اور کچھ نہ سنا گیا۔

زہرہ بی بی ـــ یہ خط پڑھ کر فوراً ہی پھاڑ دینا خدا تمہیں خوش رکھے اور سیدھے راستے پر چلائے تمہاری منگنی ہو چکی ہے، اللہ کرے جلد ہی شادی بھی ہو جائے ـــ تم میری ساڑیاں اتنے شوق سے کیوں پہنتی ہو مجھے پتہ چل گیا ہے ـــ

میری زندگی جیسی بھی گذری ـــ گذر گئی ـــ رنڈی کی عزت ہی کیا ـــ لیکن تمہارے بھائی کی بیوی اور تمہاری بھابی بن کر میں نے اس گھر میں جو بھی عزت کے دن گذارے ان کا تقاضہ یہ تھا کہ میں تمہیں غلط راستے پر چلنے سے نہ صرف ٹوک دوں بلکہ بچا بھی لوں ـــ

میری بدنامیاں تو وفادار کنیزوں کی طرح میرا دامن تھام کر عمر بھر میرے ساتھ چلیں گی ـــ میں تمہاری معصوم اور بے داغ زندگی کو یوں داغ دار کرنے میں حصہ دار بنوں یہ نہیں ہوگا ـــ

بی بی میری ساڑیاں اور چادریں استعمال کروگی تو میلی تو میری ہی ساڑیاں اور چادریں ہوں گی ـــ لیکن تمہاری زندگی کی چادر پر جو داغ پڑیں گے وہ آبِ زم زم سے دھل کر بھی پاک نہ ہو پائیں گے ـــ

خدا اور اس کے رسولؐ کے بتائے ہوئے راستہ پر چلو ـــ

یہی میری نصیحت اور یہی میری دعا ہے ـــــ
ایک بڑی بھابی ہونے کے ناطے ـــــ

میں اس گھر میں سر جھکا کر ، دلہن بن کر آئی تھی ،

خدا گواہ ہے تمہارے بھائی کے ہاتھوں کے لمس کے بعد اس جسم کو صرف ہوا ، دھوپ اور چاندنی ہی چھو سکی ہے ـــــ

اور خدا کو پھر بیچ میں لا کر تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ باقی زندگی بھی جہاں کہیں میں رہوں ، اس جسم کے چپے چپے پر صرف تمہارے بھائی کے جسم کے بے مثال محبت بھرے نقوش ثبت رہیں گے !

لیکن ـــ!

ایسی پیاری محبت کو چھوڑ کر صرف اس لئے سر جھکا کر اس گھر سے جا رہی ہوں کہ تم سر اٹھا کر جی سکو ـــ تمہاری بھابی

میں تو پہلے ہی کہتی تھی ـــــ اماں بی نے دھڑاک سے پاندان بند کیا ، زور سے پانوں کی ٹوکری لڑھکائی اور ـــــ ؛

کھا جانے والی نظروں سے صابر میاں کی طرف دیکھ کر کہا۔

" چھنال آخر چھنال ہی نکلی نا ـــ "

چرکے

ڈرائنگ روم میں خوب شور ہو رہا تھا۔ میں نے چپکے سے جھانکا تو دیکھا بھائی جان صوفہ پر بیٹھے ہوئے تھے، صوفہ کی دوسری طرف باجی بیٹھی تھی۔

ایک کرسی پر سلمیٰ بیٹھی مسکرا رہی تھی، دوسرے صوفوں اور کرسیوں پر رضیہ، ناہید، رفیعہ، زاہدہ، رفو، اور بھی دوسرے بچے شور مچانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔

"کیوں بھئی یہ شور کیوں ہو رہا ہے؟"

میں نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ارے آؤ آؤ بس تمہاری ہی کمی تھی۔" بھائی جان مسکرا کر بولے میں رضیہ کے پاس بیٹھ گئی۔ لیکن پھر اٹھ کر بھائی جان اور باجی کے بیچ میں بیٹھ گئی۔

"بھئی مجھے میرے سوال کا جواب تو ملا ہی نہیں" میں نے سب پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی۔

"ارے بھئی ہم بیت بازی کرنا چاہتے ہیں، لیکن کون کس طرف رہے؟ یہ فیصلہ کرنا ہے۔ اور اسی لئے یہ شور ہو رہا ہے۔"

باجی نے مجھے پوری رپورٹ سنا دی۔

"اونہہ ــــ بھلا یہ بھی کوئی کام ہے جس کے لئے

اتنا شور مچایا جائے۔" ہم نے اپنی بڑائی جتائی "سنو، بھئی میں، بھائی جان، اور باجی ایک ....."

"نہیں نہیں، ایسے نہیں۔ باجی ہمارے گروپ میں رہے گی۔"

ناہید اور رفیعہ میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی چیخ اٹھیں۔

"اتنا چیخو نہیں۔" میں نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے "سنو ناہید، سلمٰہ باجی اور فراز بھائی ایک طرف؛ میں بھائی جان، رفیعہ، اور رضیہ ایک طرف!"

"ہاں بھئی اب ٹھیک ہے۔" ناہید نے میری تائید کی ۔۔۔

"ہاں بھئی تو بیت بازی شروع کی جائے۔ پہلا شعر کون کہے بھائی؟"

"پہلا شعر محفل کا سب سے حسین شخص کہے۔" بھائی جان بولے۔ سب کی نظریں بے ساختہ باجی پر پڑیں۔ نظروں کی بے پناہ یورش سے گھبرا کر باجی اپنے پیر کے انگوٹھے کو قالین پر رگڑنے لگی۔

باجی تھی بھی واقعی بڑی سویٹ، اسے دیکھ کر خواہ مخواہ ندیم کے اشعار گنگنانے کو جی چاہتا۔ خصوصیت سے وہ قطعہ ؎

تیری زلفیں ہیں کہ ساون کی گھٹا چھائی ہے
تیرے عارض ہیں کہ بھولوں کو ہنسی آئی ہے
یہ ترا جسم ہے یا صبح کی شہزادی کے

ظلمت شب سے اُلجھتی ہوئی انگڑائی ہے

جب کوئی باجی کو چھیڑتا اس کا منہ سرخ ہو جاتا، اور شرما کر سر جھکا لیتی اس کی یہ ادا مجھے بےحد بھاتی، میرا دل چاہتا ہے ہمیشہ چھیڑتی رہوں۔ اور وہ سدا شرما کر سرخ ہوتی رہے سر جھکاتی رہے۔ باجی نے جھکی نگاہیں اٹھائیں، سب کو دیکھا اور بات بنانے کو بولی۔

"سلمٰی کہہ دو" پہلا شعر "

" واہ یہ حق تو آپ کا ہے "

سلمٰی مسکرا کر بولی۔

" ہائے باجی، جلدی سے شعر کہہ دو نا " کوئی اُکتا کر بولا۔

" پہلے شرط پر تو غور کرو ــ " باجی بن کر بولی، حالانکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ محفل میں سب سے زیادہ حسین وہی ہے۔

" اُف ڈری بےنیازی "

فراز بھائی جو اب تک اِس بحث سے الگ تھے باجی کو گھورتے ہوئے بولے

اس وار پر باجی ذرا جل کر بولی ؎

اندیشۂ خزاں بھی ہے گلچیں کا خوف بھی!

ہنستے ہیں پھر بھی پھول تو فطرت کا کیا علاج

بیت بازی عجیب انداز سے شروع ہو گئی۔

" کوئی جیم کا شعر کہو بھئی جلدی سے! " میں بولی۔

بھائی جان نے بہت ہی پیارا شعر کہا ہے
جنہیں تم کہہ نہیں سکتے، جنہیں ہم سن نہیں سکتے،
وہی کہنے کی باتیں ہیں، وہی سننے کی باتیں ہیں
اُسی وقت رفو جو کسی کام سے اٹھ کر چلا گیا تھا پھر ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔
"ارے بھئی رفو بھیّا! کوئی "ن" کا شعر کہو نا"
بھائی جان دس سال کے رفو کو بڑے مزے سے رفو بھیّا کہتے تھے۔ "کیا۔؟" رفو صاحب آنکھیں مٹکا کر بولے
"اجی صاحب آپ کی باجی کو "نون" کا شعر یاد نہیں ہے، کوئی شعر کہو۔"
"ذرا اُردو میں کہو نا، ایسی انگلش کیوں بگھار رہے ہو؟"
یہ رفو کی خاص اصطلاح تھی، جب وہ کوئی بات اچھی طرح نہ سمجھ پاتا تو یوں ہی کہا کرتا۔
"ارے یار تم بھی اتو کی دم ہو بس، ارے بے وقوف کوئی ایسا شعر پڑھ جس کا پہلا حرف "ن" بھائی جان رفو کا سر ہلا کر بولے۔
"اوں۔ تو یہ بات تھی۔ سنو۔" رفو صاحب نے انتہائی سادگی سے یہ شعر پڑھا ہے
ندی ہوں میں، نالہ ہوں میں
آفت کا پرکالہ ہوں میں
ایک فلک شگاف قہقہہ پڑا اور رفو جھینپ کر باہر بھاگ گیا۔

سلمیٰ نے "ن" کا شعر کہا ؎

نہ دے الزام اے ناداں زمانے کے حوادث کو
یہی فتنے تجھے ہر گام پر بیدار کرتے ہیں

میں نے سلمیٰ کے شعر کے جواب میں کہا ؎

نہ پوچھ مجھ سے مرے ہمنشیں خوشی کیا ہے
غمِ فراق کا رونا ہے زندگی کیا ہے

جلدی سے "ی" کا شعر کہو، ورنہ مات!"
رضیہ نے ڈرایا۔ فراز بھائی نے ہڑبڑا کر یہ شعر پڑھے ؎

یہ کس کا ڈھلک گیا ہے آنچل
تاروں کی نگاہ جھک گئی ہے
یہ کس کی مچل پڑی ہیں زلفیں
جاتی ہوئی رات رک گئی ہے

بھائی جان فراز بھائی کے جواب میں بولے ؎

یہ سیہ پھولوں کی ساری واقعی کیا خوب ہے
اس پہ نکھرا نکھرا رنگ و لکشی کیا خوب ہے

باجی غیر ارادی طور پہ شرما کر رہ گئی۔ اس نے سیاہ پھولوں کی ساری پہن رکھی تھی۔ فراز بھائی اپنی جگہ کسمسا کر رہ گئے۔

ناہید نے پہلی بار شعر دیا۔

یہ مے چھلک کے بھی اس حسن کو پہنچ نہ سکی
یہ پھول کھل کے بھی اس کا شباب ہو نہ سکا

میں نے جواباً یہ شعر کہا ہے

انگڑائی یہ کس نے لی ادا سے
کیسی یہ کرن فضا میں چھوٹی
کیوں رنگ برس پڑا چمن میں
کیا قوس قزح لچک کے ٹوٹی

باجی نے "ی" کا شعر کہا ہے

یونہی بیٹھے بیٹھے خیال آگیا
اگر تم نہ ہوتے تو دنیا نہ ہوتی

اور شعر پڑھتے پڑھتے باجی نے بھائی جان کو ایسی نظروں سے دیکھا گویا واقعی بھائی جان نہ ہوتے تو دنیا نہ ہوتی۔

فراز بھائی نے باجی کی یہ حرکت دیکھ لی۔ وہ تو پہلے ہی سے جلے بیٹھے تھے۔ اور بھی جل گئے غصہ اتارنے کو بہانہ تراشا:

"اختر! تم نے شعر غلط کہا ہے!"

باجی سمجھ گئی کہ فراز بھائی خواہ مخواہ غصہ دکھا رہے ہیں۔ قدرے چڑ کر بولی

"آپ کو معلوم ہو تو کہیئے نا صحیح شعر"

فراز بھائی جھلا کر بولے۔

"تو کیا میں جھوٹا ہوں؟"

باجی اکتا کر بولی

"جھوٹا کون کہتا ہے لیکن صحیح شعر تو بتائیے"

فراز بھائی کو شعر کے غلط ہونے یا صحیح ہونے سے سروکار نہ تھا۔ انہوں نے اپنی جھنجھلاہٹ یوں اتاری کہ پاس پڑا ہوا شیشے کا پیپر ویٹ باجی کے دے مارا اور بولے —

"لو یہ صحیح شعر!"

باجی نے وار ہاتھ پر روکا تو اس کے ہاتھ کی تین چوڑیاں ایک چھنا کے ساتھ ٹوٹ گئیں، اور خون بہنے لگا۔

خون دیکھ کر بھائی جان تلملا گئے۔

"یہ کیا کر دیا فراز؟"

بھائی جان تڑپ کر بولے۔

"تم بیچ میں مت بولو جی!" فراز بھائی نے ڈانٹ پلائی۔

"بولوں کیسے نہیں، اگر خون بھی کر دو تو نہ بولوں؟"

بات بڑھتی دیکھ کر فراز بھائی کمرے سے نکل گئے، اور اچھی خاصی محفل درہم برہم ہو کر رہ گئی۔

فراز بھائی تو ہمیشہ کے ضدی واقع ہوئے تھے ذرا سی کوئی بات مرضی کے خلاف ہوئی اور انہوں نے اکڑ دکھائی۔

دادی امّاں نے مرتے وقت باجی کا ہاتھ فراز بھائی کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ مرنے والی کی آرزو کون نہ پوری کرتا! باجی اُن ہی کی ہونے والی تھی۔

اور وہ اس پر جا و بے جا رعب گانٹھتے رہتے۔ بیچاری

مجبور و بے کس باجی !! کئی بار آپ ایسی محفلوں کو بے رونق کر چلے تھے۔ جب سب خوش رہتے اس وقت فراز بھائی کوئی نہ کوئی ایسی بات کر بیٹھتے کہ جس سے سب کئے کرائے پر پانی پھر جاتا۔
گھر میں کون تھا جو ان سے خوش تھا؟

ایک دن ہم سب باغ میں بیٹھے تھے، جانے کس، موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی، باجی بولی۔
"میں تو کبھی نہیں روتی، چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے ہمیشہ ہنستی ہی رہتی ہوں، کیوں ہے نا ناجو؟" اس نے مجھ سے تائید چاہی۔
"ہمیشہ کی بات تو شاید غلط ہو لیکن آپ عموماً ہنستی ہی رہتی ہیں۔"
"پھا بھائی سب کو چیلنج کوئی بھی میری آنکھ میں آنسو بتا دے۔" باجی ہنستے ہوئے بولی۔
"باجی تو اس انداز سے کہہ رہی ہے جیسے جس دن رو دے گی تو دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہی وجود میں آجائے گا۔" ناہید مجھ سے بولی۔
"تو باجی پوری سرخ ہو گئی، اور پھر جھینپ کر مسکرانے لگی۔ اور اس بات کے کچھ دنوں بعد میں نے بھائی جان کو سنایا، ——— بھائی جان! دنیا کا آٹھواں

عجوبہ وجود میں آگیا

باجی کی آنکھیں سرخ ہیں اور سوجی ہوئی بھی، شاید بہت دیر تک روتی رہی ہے۔

میں زبردستی بھائی جان کو باجی کے کمرے تک گھسیٹ لائی۔ اس نے ہمیں دیکھتے ہی الماری سے کوئی کتاب نکالی اور پڑھنے لگی کتاب کو چہرے کے سامنے یوں رکھا کہ _____ چہرہ ہماری نظروں سے اوجھل رہے۔

"باجی! اس دن کی بات یاد ہے؟ — آپ کا چیلنج؟" میں نے کتاب اس کے ہاتھ سے لے لی۔

"ہنسی اور آنسو پر کسی کا اختیار نہیں۔"

اور باجی کی بادام جیسی بڑی بڑی آنکھوں کے گوشوں سے دو آنسو اس کی گود میں ٹپک پڑے۔

"لیکن باجی! آپ تو کہتی تھیں....."

اس نے میری بات کاٹ دی۔

"ہاں کہتی تھی، لیکن تمہیں کیا معلوم ناجو، جانتی ہو جب حضرت آدم جنت سے نکالے گئے تو....."

"اب یہ آدم کی بیٹی کوئی نیا قصہ چھیڑے گی۔ یوں بھی مجھے یہ آدم اور حوا کے قصے ذرا نہیں بھاتے۔"

میں نے اکتا کر بھائی جان کو دیکھا، اور پھر باجی کو، اور پھر اٹھ کر چپکے سے چل دی۔

دروازے کے پاس جا کر میں تھوڑی دیر کے لئے، کھڑی ہو گئی،

پہلے تو باجی کی سسکیوں کی آواز پر مجھے بہت رحم آیا، بے چاری باجی، کتنا سسک سسک کر رو رہی تھی۔ پھر ایک دم ہنسی کی آواز آنے لگی۔ یہ باجی بھی بس پاگل ہی ہے۔

روتے روتے ہنسنے لگ گئی۔ کچھ بھی تو میری سمجھ میں نہ آیا۔ میں جلدی سے وہاں سے چلی آئی۔ اور وائلن پر ایک دھن بجانے لگی۔

بہت دنوں بعد پتہ چلا کہ فراز بھائی نے باجی کو ایک ایسی "کڑوی" بات کہی تھی کہ وہ آٹھواں عجوبہ وجود میں لانے پر مجبور ہو گئی تھی۔ یہ بات باجی نے ہی مجھے بتائی۔ لیکن یہ نہ بتایا کہ وہ بات کیا تھی؟

سلمیٰ بہت دنوں سے نہیں آئی تھی۔ ایک دن صبح ہی صبح سلمیٰ ٹپک پڑی۔ میں نے اسے اک دم جھنجھوڑ ڈالا۔

"بتا۔ اتنے دن سے کیوں نہیں آئی تھی؟"

"اسٹیڈی جو کرنی تھی۔" اس نے ناک سکوڑی۔

"ہونہہ، تو گویا ہم یہاں مکھیاں ہی مارتے رہتے ہیں ہے نا۔؟"

میں نے ایک چپت اس کے گلابی گال پر جما دی۔

"اور تمہیں کام ہی کیا ہے۔ ناولیں پڑھنا۔ وائلن پر الٹی سیدھی دھنیں بجانا یا پھر گھر بھر کے بچوں کو ستانا"

سلمیٰ نے ایسے انداز سے کہا کہ مجھے زور سے ہنسی آگئی
"اری سلّو !"
میں سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی "ایک بات کہوں؟"
"کیا ۔۔ ؟" وہ ہمہ تن گوش ہوگئی ۔
"باجی کا چیلنج تو یاد ہے نا ؟"
"ارے بہت اچھی طرح سے ۔"
"تو سنو ۔۔ "
میں نے دو تین دن پہلے کی پوری روداد اسے سنادی ۔
سلمیٰ بہت توجہ سے سنتی رہی اور پھر مسکرا کر بولی ۔
"لو سمجھو بیڑا پار ہے ۔"
"بیڑا پار ہے ؟ میں حیرت سے بولی "کیا بک رہی ہو بھئی ۔ اپنی تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا ۔"
"واہ ، سمجھ میں کیسے نہیں آتا ؟ یعنی بھائی جان اور باجی کی شادی بالکل پکّی !"
"وہ کیسے ؟" بات ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی تھی ۔ "اور یہ فراز بھائی جو باجی کے نام پر دھرنا دیئے بیٹھے تھے ، ان کا کیا بنتا ؟"
"تم پاگل ہو سلمیٰ ؟ ذرا عقل کی بات کیا کرو ۔"
"ناجو ! تو بڑی بھولی ہے میری ناجو !" سلمیٰ نے میرے گال پر تھپکی دے کر کہا ۔
میرے کچھ بھی پلّے نہ پڑا ، میں اکتا کر ڈرائنگ روم میں چلی آئی ۔

"ارے دوست خوب چوری پکڑی، کیا کر رہے ہو یہاں ؟ ابھی تیری امی سے کہتی ہوں، رفو کھیل رہا ہے پڑھتا پڑھاتا خاک نہیں " رفو کو ڈرائنگ روم میں کھیلتا دیکھ کر میں نے اپنی جھنجلاہٹ اتارنی چاہی۔

" کھیل کب رہا ہوں جی " وہ چڑچڑا کر بولا۔

" پھر کیا مچھر مار رہے ہو ؟"

" یہ فراز بھائی کی فوٹو تھی نا ؛ میں نے اسے نکال کر فریم میں بھائی جان اور اختر آپا کی فوٹو لگا دی ہے "

رفو تالی پیٹ کر بولا۔

" ارے ـــــ شریر ا" میں حیرت سے بولی، یہ کیا کیا تو نے ؛ فراز بھائی اگر دیکھ لیں تو زندہ بھی نہ چھوڑیں گے تجھے "

" صورت تو ایسی ہے جناب کی ۔ اور فوٹو لگا رکھی ہے ڈرائینگ روم میں ا" رفو نے بہت ہی مضحکہ خیز شکل بنائی، میں اکدم ہنس پڑی۔

" ارے رفو ! اگر بھائی جان باجی سے شادی کرلیں تو ؟"

میں نے رفو کی رائے پوچھی

" واہ بھئی ـــ واہ ـــ کیا مزہ آئے گا۔" پھر خود ہی بولا ـــ " یہ فراز بھائی سلمیٰ سے شادی کیوں نہیں کر لیتے ؛ پھر تو باجی یقیناً بھائی جان کو مل جائے گی "

" واہ رے واہ خود غرض ـــ اپنی باجی کے لئے میری

سلی کو کنویں میں پھینک رہا ہے،، میں نے اسے
دھمکایا۔
"فراز بھائی کنواں — فراز بھائی کنواں !!"
وہ تالیاں پیٹنے لگا
میں ڈر گئی، یہ فراز بھائی تو یوں ہی اوٹ پٹانگ سے
ہیں۔ اگر پتہ چل گیا کہ ناجو نے یہ خطاب دے رکھا ہے
تو بوٹیاں ہی نوچ ڈالیں۔
"ارے سنو جی!" میں اسے چپ کرنے کو بولی "بھلاجی
تم کس سے شادی کرو گے؟"
"میں —؟"
وہ بہت شاعرانہ انداز سے بالوں کو جھٹکا دے کر بولا
"میں —؟"
اور پھر میرے گال پر انگلی ٹکا کر بولا "تم سے!"
"ہونہہ — تم سے!!"
میں اسے چڑانے کو بولی "صورت تو دیکھو اپنی،
مجھ سے شادی کرنے چلے ہیں۔
وہ روہانسا ہو کر بولا —
"امی سے کہتا ہوں، ناجو کی بچی ستا رہی ہے۔"
میں اسے پکڑنے کو لپکی، لیکن وہ باہر بھاگ گیا۔
میں نے میز پر سے فوٹو اٹھالی اور سوچنے لگی —
"کاش رفو کے معصوم ہاتھوں کے صدقے یہ دونوں
ہمیشہ کے لئے ایسے ہی ایک ہو جائیں، سوچتے سوچتے میں
خود ہی مسکرا پڑی!

ایک بہار کی سہانی شام کو بھائی جان آرام کرسی پر لیٹے کچھ گنگنا رہے تھے،

باجی کوئی ناول پڑھ رہی تھی، رفو اپنے آس پاس بہت سی کاپیاں کتابیں پھیلائے اسکول کا کام کر رہا تھا۔ پڑھتے پڑھتے اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور بھائی جان سے بولا۔

"بھائی جان! HEART کے معنی کیا ہیں؟"

"رفو بھیا بات تو بڑے پتہ کی پوچھی ہے تم نے، لیکن مجھے خود نہیں معلوم، اپنی باجی سے پوچھ لو نا"

رفو باجی کی طرف دیکھنے لگا۔

"ڈکشنری میں کیوں نہیں دیکھ لیتے جی" باجی ناول میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لے رہی تھی۔

"ڈکشنری دیکھنی نہیں آتی" رفو قدرے ڈر کر بولا۔

"ہائیں؟"

باجی ناول پٹخ کر بولی۔

"اتنے بڑے ہو گئے اور ابھی تک معنی دیکھنے نہیں آتے؟ لاؤ میں بتاؤں"

رفو نے ڈکشنری باجی کے ہاتھ میں تھما دی۔

"دیکھو جس لفظ کے معنی دیکھنے ہوں اس کے شروع کے تین حرف دیکھا کرو، اب جیسے یہ HEART ہے نا....."

باجی نے ایک دم بھائی جان کو دیکھا۔ اُف! وہ،

لگا ہیں، ان میں غصہ، رحم، پیار، مسکراہٹیں، سبھی کچھ پوشیدہ تھا۔ باجی نے ڈکشنری ٹیک دی اور ناول اٹھا کر باہر نکل گئی۔ میں نے بھائی جان کو دیکھا، وہ مسکرا رہے تھے۔ میں کچھ بھی نہ سمجھ سکی۔

میں نے ڈکشنری اٹھالی، اور دیکھنے لگی کہ کون سی چیز باجی کو ناراض کر سکتی ہے۔ ارے، یہ کیا؟ دل کی شناخت کے لئے چھوٹا سا جو دل بنا ہوا تھا اس میں سیاہی سے لکھا ہوا تھا، بیحد باریک باریک حرفوں میں۔

"دل کو ہے تم سے پیار کیوں؟ یہ نہ بتا سکوں گا میں۔"

"کیا ہے ناجو؟" بھائی جان نے مسکرا کر پوچھا۔

"کسی شیطان نے اس میں کچھ لکھ مارا ہے، باجی نے اسے اپنی طرف منسوب کر لیا جبھی تو چڑ کر چلی گئی۔"

میں نے ڈکشنری بھائی جان کے سامنے کر دی۔

"ناجو! میرا خیال ہے میں ہی وہ شیطان ہوں۔"

"آپ؟" میں کھوچکی رہ گئی۔ "بھائی جان!"

"کیا ہے ناجو؟"

"میں اٹک اٹک کر بولنے لگی۔

"تو..... کیا..... آپ.....؟"

"تم نے سمجھنے میں بہت دیر کی ناجو! یہ بات تو تم سے زیادہ رفو جانتا ہے۔ ہے نا رفو بھیا؟"

بھائی جان رفو سے مخاطب ہو گئے۔ رفو صاحب کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی مسکرانے لگے۔ اور میرے پیٹ میں چوہے کودنے لگے کہ کب یہ بات سلمیٰ کو سنا سکوں گی۔

لیکن اس دنیا میں جو سوچو وہ کہاں ہوتا ہے۔ ہر ارمان اور ہر آرزو پوری ہو جائے تو دنیا کا نام دنیا نہ رہے۔ تمناؤں اور ارمانوں کے سسکنے اور پورا نہ ہونے کا نام ہی دراصل، دنیا ہے؛

لاکھ سوچو، وہی ہوتا ہے جو قسمت کا لکھا ہوتا ہے۔ قسمت کا لکھا کبھی نہیں مٹتا۔ انسان ہر چیز پر قادر ہونے کے باوجود کتنا بے بس ہے۔

فراز بھائی اور باجی کی شادی ہو ہی گئی۔ ہمارا گھر اچھا خاصہ ویرانہ بن گیا۔ جیسے اس گھر میں کبھی قہقہے گونجے ہی نہ تھے۔

جیسے اس اجڑے باغ میں کبھی بہار آئی ہی نہ تھی۔

سلمیٰ نے بی۔ اے کے بعد ایم۔ اے میں داخلہ لے لیا تھا۔ اس نے بھی آنا کم کر دیا تھا۔ کبھی کبھار آجاتی، جب کبھی وہ آتی تو ہم دونوں باجی کی باتیں کرتے۔ باجی ـــــ باجی کتنی پیاری تھی، کتنی سوئٹ تھی، پھولوں کی خوشبو چاندکی کرنوں، سورج کی شعاعوں سے زیادہ پیاری اور حسین باجی، جو زندہ ہوتے ہوئے بھی ہم سے اتنی دور تھی کہ ہم اسے حاصل نہ کر سکے

میں بلی کی طرح ہر چیز کو سونگھتی پھرتی۔ کسی کام میں دل نہ لگتا۔ وائلن بجانے بیٹھتی تو وہ الٹی سیدھی تانیں نکلتیں کہ طبیعت جھلا جاتی۔

ناول، جو میری زندگی تھے، جنھیں میں امتحان کے دوران

میں بھی پڑھتی رہی، اب مجھ سے نہ پڑھے جاتے، کتابوں پر گرد کی تہیں جم گئی تھیں۔

باغوں میں پھول اب بھی کھلتے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا، جیسے ان میں وہ خوشبو نہیں، وہ روپ نہیں۔ وہ نکھار نہیں۔

رفو نے ڈرائنگ روم میں پھر فراز بھائی کی فوٹو لگادی تھی۔ اب اس کے معصوم قہقہے بہت کم گونجتے، باجی سب کی روحِ رواں تھی وہ کیا گئی، باغوں کی بہاریں چلی گئیں۔

پھولوں کی خوشبوئیں گم ہو گئیں، زندگی کی رنگینیاں مر گئیں۔ ستاروں کی روشنی، ہواؤں کی مسک، چاند کی چاندنی بے نور ہو کر رہ گئیں،

ایسا محسوس ہوتا جیسے ہر چیز اپنی اصلیت کھو بیٹھی ہے۔ ہم سب نے جو سہانا سپنا دیکھا تھا۔ اس کی بھیانک تعبیر، ہمارے سامنے تھی،

بھائی جان دن بھر اپنے کمرے میں بند رہتے، ان کی صحت گرتی جا رہی تھی۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ اگر انہیں دلی خوشی نہ ملی تو وہ بھی ہو جائے گی، دو تین سال یوں ہی گزر گئے، اور بھائی جان دق کے راستے پر گامزن ہو گئے!

بھائی جان کی طبیعت بہت خراب ہو چکی تھی، زندگی کی کوئی امید باقی نہ رہ گئی تھی باجی بھائی جان کو دیکھنے آئی تو اس کی گود میں ننھا جاوید بھی تھا۔

بالکل بھائی جان جیسی آنکھوں والا ۔۔۔ ہم نے یہ بھی سنا کہ فراز بھائی اس بات پر بہت چڑتے ہیں کہ جاوید کی آنکھوں میں بھائی جان کیوں جھلکتے ہیں ؟

ایک دن سلمیٰ بھی آئی ہوئی تھی، ہم سب اسی ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے، بھائی جان پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے۔ ان کی پائنتی فراز بھائی بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے ان کے بازو ہی باجی بیٹھی بھائی جان کے پیر دبا رہی تھی۔ میں جاوید کو لئے چپ چاپ سی ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔

"ناجو، باجی بیت بازی کریں گے نا ؟" ناہید بولی

مجھے دو تین سال پہلے کا وہ دن یاد آگیا، جب ہم بیت بازی کر رہے تھے اور باجی بے قصور پٹ گئی تھی۔

باجی نے گہری گہری نظروں سے ناہید کو تاکا اور بولی

"گزر گئیں جو بہاریں اب ان کی یاد ہی کیا"

میں نے اُن ہی افراد کی دو پارٹیاں پھر بنا دیں، بھائی جان بے حد کمزور آواز سے بولے۔

پہلا شعر محفل کا سب سے حسین آدمی کہے"

سب چونک سے پڑے اور سب کی نظریں باجی پر مرکوز ہو گئیں، مجھے بہت تعجب ہوا جب باجی نے بغیر کسی حیلے بہانے کے خود ہی یہ شعر پڑھ دیا ؎

اندیشۂ خزاں بھی ہے گل چیں کا خوف بھی
ہنستے ہیں پھر بھی پھول تو فطرت کا کیا علاج

اور دو موٹے موٹے آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر بھائی

جان پیروں پہ گر پڑے گرم گرم آنسو !! اپنے جلو میں آہیں
کی ... سلے دگرم آنسو ؛

بھائی جان چونک سے گئے وہ سمجھے شاید یہ سگریٹ کی گرم راکھ گر رہی ہے۔ پیر سمیٹے ہوئے کسی قدر جھلا کر بولے۔
"یار ـ فراز ! ہاتھ پرے کرکے سگریٹ کی راکھ نہیں جھٹکی جاتی، پیر کو چرکے لگ رہے ہیں"

تخت طاؤس

اماں نے خط لکھوانا شروع کیا۔

"لکھو بیٹی۔۔۔۔"

" پتہ نہیں ان بوڑھی آنکھوں کو کیا پتہ سہرا اور چاند ایسی دلہن دیکھنا نصیب ہو ۔۔۔ یہاں تو ہر دن موت سے قریب تر ہو رہی ہوں۔ تو ایک بار چند روز کے لئے ہی سہی آجا۔۔۔۔"

اماں بولتی رہیں ۔۔۔ ان کے گلے میں رہ رہ کر پھندے سے پڑتے رہے ۔۔۔

آنسو پی پی کر ، بہا بہا کر جب وہ خط مکمل کروا چکیں تو آس بھرے لہجہ میں بولیں ۔۔۔

" بیٹی اس کا جواب کب تک آجائے گا ۔۔ ؟"

" جواب ۔۔ ؟"

میں نے حلق میں پھڑ پھڑاتے دل کو بڑی مشکل سے قابو میں کر کے کہا

" یہی کوئی بارہ پندرہ دن میں اماں ۔۔"

" اماں ۔۔۔" میں نے چیخ چیخ کر کہنا چاہا ۔۔۔ " یہ سارا کھیل اب مجھ سے نہیں کھیلا جاتا ۔۔۔ تم جو ہر پندرہ دن کو ایک خط لکھواتی ہو وہ میری طرف سے ہوتا ہے اور جو جواب تم لکھواتی ہو وہ تمہارے بیٹے تک نہیں پہنچ سکتا، کیونکہ اماں آج تک کوئی ہرکارہ ایسا پیدا نہیں ہوا جو مرنے والوں تک خطوں

کو پہنچا سکے — میرا صبر مت لوٹو اماں — تمہارا بیٹا، تمہارا شہزادہ — وہ تمہاری زندگی کا اکلوتا اور آخری سہارا جنگ میں کام آچکا ہے — تم اسے خط لکھواتی رہو گی، اس کی دلہن کے لئے جوڑے سی سی کر رکھتی رہو گی، لیکن وہ اس جگہ جاچکا ہے اماں، جہاں تمہارے آنسو اور آہیں بھی نہیں پہنچ سکیں — ۔

لیکن میں نے اماں کے کمزور، ناتواں اور دکھوں سے بوجھل جھکے ہوئے وجود کو دیکھا اور اپنے پہلو میں لوٹتے دل کو مسوس کر، ذرا بشاشت سے کہا۔

"اماں خطوں میں دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے، تم اتنی بے کل کیوں ہو جاتی ہو — اس کا دنیا میں سوائے تمہارے کوئی ہے — ؟

پھر وہ تمہیں یاد نہ کرے گا تو اور کسے کرے گا —؟"

"ارے نہیں بٹیا — وہ جھلاتے ہوئے — پیار سے لبریز لہجہ میں بولیں — "ان آج کل کے چھوکروں کا کوئی ٹھیک نہیں ہے، چار یار دوستوں میں مل بیٹھے اور یہ بھی بھول گئے کہ کوئی ماں بھی ہے — "

"ارے نہیں اماں تم غلط سوچتی ہو — یوسف ایسا نہیں ہو سکتا — "

"اب بٹیا تو اس کی طرف سے نہیں بولے گی تو کون بولے گا ویسے تو ہمیشہ تو خود اس سے جھگڑتی رہی لیکن جاں میں نے کچھ کہا تجھے او بڑا کر اس پر پیار آیا — ہاں بٹیا یہ بھی یاد سے لکھ دینا کہ منہ دکھائی میں تو اپنی دلہن کو انگوٹھی پہنائے

گایا کلائی پر گھڑی باندھے گا ـــــ مجھے تو ایک ایک چیز، جوڑنی ہے، وقت پر ایک دم سے سوجھتا بھی تو نہیں۔ یاد سے پوچھوا لینا بیٹی ـــــ"

"ہاں اماں ـــــ" میں نے سر جھکا لیا ـــــ "اور کچھ کہنا ہے اماں۔؟"

میں نے ٹوٹتے دل سے پوچھا۔

"نا بٹیا ـــــ اب کیا کہنا ہے ـــــ اور جو پوچھے تو اتنا کہنا ہے کہ آسمان جتنا بڑا کاغذ بھی کافی نہ ہو۔ یہ ماں کا دل ہے نا بٹیا ـــــ اس کے پیار اور ممتا کا کوئی اور چھور نہیں ہے ـــــ"

میں اٹھنے لگی تو اچانک جیسے انہیں پھر کچھ یاد آ گیا ـــــ

"بٹیا یہ بھی پوچھ لینا کہ آج کل تو نیا زمانہ ہے، نئے نئے فیشن نکلے ہیں ـــــ ہمارے زمانے میں تو سہاگ کا سرخ جوڑا چڑھتا تھا، اب تو گلابی، نارنجی اور سفید تک چڑھنے لگے ہیں، اپنی پسند کا رنگ بتلا دے ـــــ"

وہ ان دیکھی دلہن ـــــ وہ پھولوں بھری سہاگن جو وقت سے پہلے ہی بیوہ ہو گئی، اماں اسے کون سا رنگ سجے گا نہ دولہا ہے نہ دلہن ـــــ

اماں یہ بوجھ اٹھاتے اٹھاتے اس راز کو پالتے پالتے مجھے دق ہو جائے گی ـــــ مگر میں نے خود کو سنبھال کر، کہا ـــــ!

اطمینان رکھو اماں میں سب لکھ دوں گی ـــــ" اور

اپنے کمرے میں آکر میں سسک پڑی۔

اماں بے چاری کے نصیب بھی کیا نصیب تھے۔

بچپن سے غریبی میں گذر بسر ہوئی ــــ جوانی آنے پر ماں باپ نے اپنی ہی حیثیت دیکھ کر شادی کر دی ــ شادی کے ایک ہی سال بعد ایک معمولی سی بیماری میں میاں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

یوسف باپ کی موت کے دو ماہ بعد دنیا میں آیا۔ جوان بیوہ کا اکلوتا سہارا ــــ غریبی کے ہاتھوں نوکری ڈھونڈتی ڈھونڈتی جب وہ ہمارے در پر پہنچی ہیں، اس وقت ہمارے یہاں صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔

کئی ننھی ننھی جانوں کو چھوڑ کر میری امی موت کو اپنا چکی تھیں۔ بڑے بچے تو کیسے بھی پل ہی جاتے ہیں مگر ایسا بچہ جس نے ماں کے سینے کے گرم اور نرم زندگی بخش لمس کو محسوس تک نہ کیا ہو، جس نے ابھی دنیا کو آنکھ کھول کر دیکھا تک نہ ہو، ایک دم بھری پری دنیا میں تنہا رہ جائے تو ــــ یہ کوئی اس دل سے پوچھے جس کے سر اتنے سارے بچوں کی ذمہ داری آ پڑی ہو۔

زینت بی کو فوراً ہی ملازمت پر لے لیا گیا کیونکہ ان کی اپنی گود میں خود ایک چھوٹا سا دودھ پیتا بچہ موجود تھا۔ چھوٹے بھلے سے دوسروں کے ہوں، ان کو ایک ایسی عورت ہی پال سکتی ہے۔ جس کے اپنے دل کو مامتا کی کلپ لگی ہوئی ہو ــــ!

مگر زینت بی نے تو کچھ زیادہ ہی کر دکھایا، اپنے نسبتاً بڑے بیٹے کو انہوں نے اوپر کے دودھ پر لگا دیا اور اپنے نئے مالکوں کی بچی کو یعنی مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔

راتوں کی نیندیں اور دن کا چین حرام کر کے اپنے جسم کا خون پلا پلا کر انہوں نے گھر والوں سے ایک التجا کی۔

"غلطیاں انسان سے ہی ہوتی ہیں، میں بھی انسان ہوں خطاؤں کی پوٹ ؛ مگر میرے کسی قصور پر مجھے اس گھر سے نہ نکالا جائے۔ اس بچی سے جدا نہ کیا جائے، اس کے بغیر میں جی نہ سکوں گی

میں نے اس کے لئے نو مہینے کا وہ کرب نہیں جھیلا، جسے جھیل کر ایک ماں جنت کی خالق بنتی ہے۔ مگر میں نے اسے اپنی جوانی نذر کی ہے جو ایک عورت کا سب سے خوبصورت سرمایہ ہوتی ہے۔"

اور یہ حقیقت تھی کہ میری خاطر راتوں کو جاگ جاگ کر وقت بے وقت کی روں روں پر اپنا چین لٹا کر انہوں نے اپنے خوبصورت سیاہ بالوں کو تم ناک اُجالے عطا کئے تھے اور وہ جو سارے گھر کی محض زینت ہی تھی ان دو ننھے منے ہونٹوں کی جنبشوں نے پہلی بار بولنا سیکھا تو اماں ہی سیکھا۔ شروع سے اخیر تک صرف اماں ہی اماں تھیں۔

اور وہی ایک ہیں اماں جو خوبصورت خطاب کی مستحق ہو سکتی ہے۔ جو کسی معصوم کی تکلیف پر آنکھیں نم کر کے اور یہاں تو ساری زندگی بھر کے لئے، میری خاطر آنسوؤں کا ٹھیکہ لے لیا تھا۔

میں جب ذرا بڑی ہوئی اور ایسی چاہنے والی ماں کا اصل روپ دیکھا اور جانا تو میرا دل درد اور کرب سے بھر گیا ان کی وہ چھوٹی اور اندھیاری کوٹھری جھلنگی چارپائی سن کاٹ صابن سے دھلی چادر ۔۔۔ غریبانہ مگر صاف ستھرا بستر میں نے پہلی بار اپنے حسابوں ان سے بڑا بھاری وعدہ کیا تھا۔

"اماں جب میں بڑی ہو جاؤنگی تو تمہیں چاندی کے تخت پر بٹھاؤنگی خوب نرم نرم ریشمی روئی بھرا گدا اس پر ریشمی چادر ۔۔۔

ساری دنیا آئے گی اور دیکھے گی اور حیرت سے پوچھے گی بھئی یہ چاندی کے اس شاندار تخت پر کون بیٹھا ہے۔"

اور میں بڑے فخر سے سب کو بتاؤں گی ۔۔۔۔ "یہ میری اماں ہیں ۔۔۔!"

اماں بڑے پیار سے ہنس پڑی تھیں اور مسکرا کر بولی تھیں ۔۔۔!

"اور یہ یوسف میرے لئے کچھ نہ کرے گا ۔۔۔؟"

"کرے گا کیسے نہیں وہ بڑا ہو کر تمہارے لئے ایک چاند ایسی بہو لائے گا ۔ پھر اپنے گھر میں خوب سارے ننھے بچے ہوں گے، اور مارے شور کے تم ان کے پیچھے بوکھلا کر بھاگو گی ۔۔۔"

یہ خواب ایک ساتھ میں نے اور اماں نے دیکھا تھا۔ مگر خواب کی تعبیر یہ تھی کہ اماں کا جوان بیٹا جنگ میں مارا جا چکا تھا۔ اور وہ آس بھری نامراد ماں ہر پندرہ دن

میں اپنے جگر گوشے کو ایک خط لکھوا رہی تھی کہ میرے اعضاء جھک گئے ہیں۔ سر پر سورج سایہ فگن ہے، دکھوں اور غموں نے وقت سے پہلے ہی الوداع کہہ دیا ہے، ایسے میں آنکھوں کی ایک ہی تمنا ہے کہ تجھے دولہا بنا دیکھیں"

اماں مجھے یوسف سے کسی بھی طرح کم نہ چاہتی، وہ نہ یوسف کی جدائی شاید انہیں مار ہی ڈالتی۔ انہیں خود بھی اس بات کا احساس تھا کہ وہ مجھے بے پناہ چاہتی ہیں اور میں تو خدا کے بعد انہی کے سہارے زندہ رہی تھی۔

ایسے میں یہ میرے لئے کیسے کرب کی بات تھی کہ پچھلے کئی سال سے اس راز کو پالے جا رہی تھی۔

لگتا تھا دل میں پھوڑا ہو جائے گا اور یہ بوجھ کسی دن یوں بڑھے گا کہ میرا دل پھٹ جائے گا۔

میں اس دن کے بارے میں سوچتی کہ جب ایک غمناک سے دن ایک خط آیا تھا۔ جس نے ہمیں یہ اطلاع دی تھی کہ یوسف میدان جنگ میں کام آگیا۔ اگر میں ضبط اور حوصلے سے کام لیکر اسی دن اماں کو بتا دیتی کہ اماں تم نے جو ایک پودا لگایا تھا وہ بھری جوانی اور بھری بہار میں منہ موڑ گیا ہے۔ اور اب زندگی بھر کے لئے تمہاری آنکھوں میں آنسو ہیں، تو شاید وہ جو دکھ سہتے سہتے پتھر بن چکی تھیں، یہ وار بھی سہہ جاتیں۔

لیکن میں خود ہی یہ قدم نہ اٹھا سکی، اور میں نے ایک بڑے جوکھم کا فیصلہ کر لیا۔

" میں زندگی بھر ـــ اماں زندگی بھر اس راز کو پالتی رہوں گی کہ یوسف مر چکا ہے ــ "

یوسف ہر ماہ اپنی تنخواہ میں سے اماں کو ۲۵ روپے بھی بھجواتا تھا۔

یہ مرحلہ میرے لئے سب سے کٹھن تھا۔ میں پچیس روپے ماہانہ آخر کہاں سے لاؤں گی ـــ بہر حال یہ منزل بھی طے کرنی ہی تھی۔

میں اماں کی طرف سے خط لکھتی ـــ ان بچاری کو تو لکھنا پڑھنا آتا ہی نہ تھا۔ وہ مجھ سے کہتی، میں لکھتی جاتی پھر یوسف کی طرف سے بھی میں خود ہی جواب لکھ کر پوسٹ کر دیتی۔

یوسف کی زندگی میں مخصوص فوجی نمبروں والے خط آتے تھے۔ ممکن ہے اماں تاڑ جائیں کہ اب خط ویسے نہیں ہوتے۔ تو اب میں خط کاپی میں رکھ کر انہیں سنایا کرتی تھی ـــ ہر مہینے بڑے جتن سے منی آرڈر کرتی اور اماں انگوٹھا لگا کر وہ روپے وصول کر لیتیں اور خوش ہو ہو کر خرچ کیا کرتیں ـــ!

"اے بیٹی ــ اب کی بار چاندی کی پازیب خرید لینگے دلہن سارے میں چھم چھم کرتی گھومے گی تو گھر میں بڑی رونق لگے گی ـــ"

" بٹیا ــ اب کے ناک کی نتھ بنوائیں گے۔ نتھ نہ ہو تو دلہن کے نور نہیں نکلتا ـــ نور نہیں اترتا۔"

" بیٹی اس ماہ کنگن خرید لیں ــ ؟ کنگن نہ کھنکیں

تو.....

میں سوچتی ـــ میری شادی ہو جائے گی تو کون اس راز کو پائے گا ـــ ؟

شادی تو بہر حال ہونے ہی والی تھی ـــ پھر سوچتی اماں کو اپنے ساتھ ہی اپنی سسرال لے کر کیوں نہ چلی جاؤں ـــ ؟

لیکن ہم کچھ اور سوچتے ہیں وقت کچھ اور کرتا ہے۔ میری شادی کی بات ابھی پکی ہوئی ہی تھی کہ اماں کو نمونیہ ہو گیا اور آخری بلاوا آگیا ـــ

شاید مرنے والوں کو احساس ہو جاتا ہے کہ یہ ہماری آخری گھڑی ہے ـــ

انہوں نے مجھے اپنے پاس بلایا اور رک رک کر بڑی مشکل سے بولیں ۔

" بیٹا تو جنتی ہے ـــ تجھ ایسی بیٹیاں صدیوں میں پیدا ہوتی تھیں ـــ تو نے میرے لئے وہ کیا جو بیٹ کی بیٹی بھی نہ کرتی ـــ "

" اماں میں تمہارے بیٹ ہی کی بیٹی ہوں ـــ تم نے مجھے زندگی دی تھی اماں ـــ ، اپنا خون پلایا تھا۔ اور اولاد کسے کہتے ہیں اماں ـــ ؟"

" نہیں بیٹا ـــ بیٹ کی اولاد بھی اتنا نہیں کر سکتی جو تو نے کیا ـــ بیٹا "

وہ کراہ کر بڑے آنسو بھرے لہجہ میں بہت

رک رک کر بول رہی تھیں۔

"بٹیا جس دن یوسف کی موت کا خط آیا، میں ساتھ والے کمرے میں صفائی کر رہی تھی اور تو سمجھی کہ میں باورچی خانے میں ہوں ۔۔۔ بڑے ماموں کو تو نے خط سنایا اور کہا ۔۔۔

"ماموں میاں، امّاں کو یہ بات معلوم نہیں ہونی چاہیئے۔ ورنہ وہ رو رو کر جان سے چلی جائیں گی.... امّاں ۔۔۔"

میں چیخی ۔۔۔ مگر انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک دیا۔

"میں نے سوچا جب میری بیٹی میری جان مجھے دکھی نہیں دیکھنا چاہتی تو مجھے بھی اس راز کو پالنا ہی ہوگا۔ اور میں نے بھی اپنی وہی پرانی روش قائم رکھی ۔۔۔ مرنے والا تو جان سے گیا، مگر تیرے لئے میرا دل کیسے کیسے ٹوٹتا تھا میری بیٹی ۔۔۔

لیکن اگر میں کہہ دیتی کہ مجھے سب معلوم ہے مجھے پتہ ہے کہ یوسف مر گیا، تو تو مجھے غمگین نہ دیکھ پاتی اور میں تیرے آنسو نہ دیکھ پاتی ....."

میں پتھر کی مورت بنی سن رہی تھی اور وہ رک رک کر کہے جا رہی تھیں ۔۔۔

"میں نے وہ سب زیور دراصل تیرے لئے خرید رکھے ہیں بیٹی ۔۔۔

پیسہ تو اٹھ ہی جاتا ہے بیٹی ۔ اس سے زیادہ تیز رفتار شے میں نے آج تک نہیں دیکھی، دھیمے قدموں آنے والا تیزی سے جانے والا ۔ اسی کے کارن میرا بیٹا مجھ سے چھٹا ۔"

سوچتی تھی میری بٹیا جو اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر یہ روپیہ مجھے بھجوا رہی ہے اسے فضول نہ گنواؤں، اب میرا آخری وقت ہے بیٹی ۔ تیرے سامنے تیری زندگی ہے، خدا کیسے میری دعا پوری نہ کرے گا۔ واہ مجھے ہر خوشی سے نوازے گا بیٹی ۔ تیری ایک آرزو تھی بیٹی کہ مجھے چاندی کے تخت پر بٹھائے ۔ تو نے تو مجھے اس تختِ طاؤس پر بٹھایا ہے بیٹی جسے دل کہتے ہیں ۔ میں اس دل کی عظمت کے آگے اپنا سر جھکاتی ہوں بٹیا.... اور سر رکھنے کی کوشش میں اماں جو آگے کو ہونے لگیں تو لڑکھڑا کر بچے کو جا پڑیں ۔ پھر وہ کبھی نہ اٹھ سکیں ۔

میں رونا چاہتی ہوں تو مجھے اماں کی وہ بات یاد آتی ہے کہ ۔" میں تیری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتی تھی اسی لئے اس راز کو پالے رہی ۔" میں آنسو ضبط کرنا چاہتی ہوں. کر بھی لیتی ہوں ۔ لیکن روتے ہوئے دل کو کیسے منع کروں ۔ ؟ کیسے سمجھاؤں ۔ ؟

پیٹ

سہاگ رات کس قدر گرم تھی!
حالانکہ اس کی شادی جاڑوں کے ٹھنڈے ٹھنڈے برف سے دنوں میں ہوئی تھی۔
سرخ سرخ کپڑوں میں لپٹی اس کی دلہن۔ جیسے انگیٹھی، دہک رہی ہو ـــــ لیکن انگیٹھی تو کبھی نہ کبھی سرد پڑ جاتی ہے ـــــ اس کی دلہن تو سدا بہار آگ تھی۔
دوستوں کا سکھایا پڑھایا قطعاً کام نہ آیا، مدتوں تو وہ یونہی دلہن کو یک ٹک دیکھے گیا، ساری گھبراہٹ یہ تھی کہ حسن کی اس مورتی کو دیکھتے دیکھتے ہی رات صبح سے نہ بدل جائے، لیکن دیکھنے سے جی بھرتا تو وہ ہاتھ پاؤں ہلاتا ـــــ
یہاں تو مرنے والے کی طرح جسم کا سارا دم دو آنکھوں میں آکر اٹک گیا تھا۔
آنکھوں کا دل تو بھرنے سے رہا۔ اس نے ایک ترکیب سوچی۔ "آنکھیں بند کر لوں نے؟"
وہ مسکرایا پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور نرم نرم گڑیا کو باہنوں میں بھر لیا۔
وہ پاگلوں کی طرح بکھر رہا تھا۔
"میں تمہاری دھجی دھجی اڑا دوں گا ـــ"

ہلکی ہلکی کسمساہٹ اور شرم کے ساتھ دلہن " نہیں نہیں"
کہتی جا رہی تھی، لیکن انداز بیاں میں بھی ایک سپردگی تھی۔

" پلیز۔۔۔ پلیز۔۔۔۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ، اپنا سراپا چھپا چھپا لیتی
لیکن وہ اپنی طاقت کے بل پر اس کے ہاتھوں کے پیالے
میں سے چہرے کا پھول اپنے ہونٹوں کے قریب لے آتا۔۔
وہی التجا۔۔۔

پلیز۔۔۔ پلیز۔۔۔۔

پلیز نہ دلیز۔۔۔" وہ وحشی ہوا جا رہا تھا، "پھر تم
اتنی حسین کیوں ہوئیں۔۔۔؟"

اور وہ سہاگ رات والی بے قراری آج چھ سال،
گزرنے پر بھی اسی طرح قائم تھی اور وہ دیوانہ کر دینے
والا حسن دو بچوں کو جنم دینے پر آج بھی اسی طرح قائم تھا۔

وہ دونوں جب کبھی گھومنے پھرنے جاتے محمود
ہمیشہ ساتھ میں ایک تیز دھار والا چاقو اپنے ساتھ لئے
رہتا، پہلے پہل اس نے گھبرا کر پوچھا تھا۔

" یہ۔۔۔۔ یہ اتنا بڑا اور تیز چاقو۔۔۔ یہ پھینک،
دیجئے۔۔۔ مجھے اس سے ڈر لگتا ہے، آخر اس کا مصرف
کیا ہے۔۔؟"

" مصرف۔۔۔؟"

وہ خوشدلی سے ہنسا تھا ـــــ "ارے بابا میں کوئی ایسا غنڈہ نہیں ہوں جو چاقو چھرے اپنے ساتھ لئے، گھومتا رہوں لیکن جانِ من تم اس قدر حسین ہو اور اتنی عزیز ہو کہ میں برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی اور تمہیں نظر بھر کے بھی دیکھ لے"

"وہ ہنسی ـــ ارے واہ ـــ سڑک پہ بغیر پردے کے چلیں گے تو کسی نہ کسی کی نگاہ تو پڑے گی ہی ـــ"

"نہیں ـــ" وہ بری طرح چیخا تھا ـــ پھر وہ اپنے لہجہ کی تندی پہ ذرا شرمندہ ہو کر بولا ـــ

"معاف کرنا میری چاند ـــ میری ثریا ـــ اس معاملے میں میں بڑا ہی قدامت پرست اور حاسد ہوں جو تمہیں بری نظر سے دیکھے گا وہ سیدھا اللہ میاں کے پاس پہنچ جائے گا...."

یہ سارا محبت کا کھیل تھا، لیکن ثریا نے سہم کر سوچا۔

"اللہ نہ کرے جو کبھی میں بھٹکوں۔"

سہاگ رات کا نشہ ایسا نشہ تھا جو ایک بار چڑھا تو پھر کبھی اترا ہی نہیں۔ لڑکی دلہن بنتی ہے ـــ دلہن سے ماں ـــ ماں سے عورت ـــ ماں بن کر کہنے والے کہتے ہیں عورت اپنا وہ چارم اور جادو کھو دیتی ہے جو مرد کو باندھ کر رکھتا ہے۔

جسم ڈھل جاتا ہے تو مرد کی محبت بھی چاند کی طرح ڈھل جاتی ہے۔ لیکن ثریا تو جیسے اتنے سارے

دنوں سے کسی برف خانے میں بند رہی تھی۔ وہی کسا ہوا جسم ـــ وہی دلبری کی ادائیں ـــ وہی بہکا دینے والی معصومیت ـــ وہی گمراہ کر دینے والی شریر آنکھیں ـــ

سنیچر کی رات اپنے دامن میں دیوانگی کے جراثیم لے کر آتی ـــ

"آج میں بادشاہ ہوں ـــ" محمود فخر سے سینہ پھلا کر کہتا ـــ "جانتی ہو کہ ـــ آج سنیچر ہے۔ آج ہماری سہاگ رات ہے کل اتوار ہے، جی بھر کر جاگیں گے اور کل جی بھر کر سوئیں گے"

دل میں خوش ہو کر، بظاہر شرما کر ثریا بولتی ـــ اور جو یہ دو دو رقیب روسیاہ ہیں ـــ؟" اس کا اشارہ، بچوں کی طرف ہوتا۔

"افیون کھلا کر سُلا دیں گے سالوں کو ـــ" وہ خوش دلی سے ہنستا ثریا ہنس دیتی ـــ ہنسے ہی جاتی اور رات جب چپکے سے اپنا آنچل پھیلاتی محمود نئے، دولہوں کی سی بے قراری سے بچوں کے سو جانے کا انتظار کرتا اور جیسے ہی بچے سوتے وہ جھپٹ کر ثریا کو گود میں اٹھا کر بھاگ جاتا۔

دوسرے کمرے میں لا کر وہ اسے دھیرے سے صوفے پر لٹا دیتا۔ اور جاڑوں کے ٹھنڈے ٹھنڈے برف جیسے دن گرمیوں کی طرح تپنے لگتے

"کہو تم میری ہو ــــ"

اس کی بے وقوفیوں سے تنگ آکر وہ بچوں کی طرح جواب دیئے جاتی ــ

"ہاں بابا آپ کی ہوں ــ"

"ہمیشہ میری رہو گی نا ــ ؟ ہر حال میں ــ !"

"سو فیصد ــ"

"کبھی کسی کی طرف جھکو گی تو نہیں نا ــ ؟"

وہ ہنس دیتی ــ "میں بھی سدا تمہارا ہی رہوں گا ــ"

اور یہ حقیقت تھی کہ ہر حال میں وہ اسی کی تھی، اب جبکہ چند مہینوں سے اس کی نوکری چھوٹ گئی تھی اور دانے دانے کی محتاج ہو گئی تھی۔ گھر کا سامان بکنے کی نوبت آگئی تھی وہ اسی کی تھی ــ

بے حد صابر اور شاکر نہ ہونٹوں پر فریاد نہ چہرے پر شکایت ــ

کبھی کبھار وہ خود کو گنہ گار محسوس کرتا۔ جب نوکری پرمننٹ نہیں تھی تو مجھے شادی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ آخر ۔ کسی معصوم کی آرزوؤں کا گلا گھونٹنے کا اختیار مجھے کس نے دیا تھا ــ ؟

لیکن یہ بھی کسے معلوم تھا کہ ادھر بیچ میں یوں نوکری چھٹ جائے گی اور وہ ایم اے کی ڈگری لٹکاتا یوں ہی نلے کھاتا پھرے گا ــ پھر بھی وہ اس کی تھی۔

سنیچر کی ہر رات وہ بادشاہ تھا ـــــ ویسے تو بیکاری نے ہر دن کو اتوار بنا دیا تھا ـــ لیکن سنیچر کی رات "سہاگ رات" منانے کی جو عادت اس کی سرشت میں پڑ گئی تھی وہ، بہر حال، برقرار تھی۔

مرد غریب ہو جائے تو کچھ وہی سا ہو جاتا ہے ورنہ کوئی بات نہ تھی جو محمود یہ سوچنے لگتا کہ ثریا بدل سی گئی ہے ـــ ـــ اور یہ صرف پندرہ دنوں سے وہ محسوس کر رہا تھا۔

پچھلے سنیچر کو جب اس نے اپنی چاند جیسی چمکیلی اور مصری کی ڈلی جیسی میٹھی دلہن کو بچھونے میں بھرا تو جذبات سے ٹوٹ کر بولا۔

"خدا کی قسم کیا عورت ہو ـــ نامرد بازو بیٹھ جائے تو مرد ہو جائے ـــ"

لیکن اتنے بھرپور، تعریف سے لبریز جملے کا ثریا نے کوئی نوٹس ہی نہ لیا ـــ چپ چاپ لیٹی رہی۔

ورنہ عورت ـــ اور بچوں والی عورت، جسے اپنے شباب کے بکھر جانے کا ذرا زیادہ ہی احساس ہوتا ہے تھوڑی سی تعریف سن کر کھل ضرور جاتی ہے، مگر وہ تو مسکرائی تک نہیں۔

اس نے پے در پے اس کے کئی پیار لے ڈالے، تب بھی وہ جیسے اپنے ہی خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔

"تم مجھ سے کچھ کترا رہی ہو ثریا ـــ؟" اچانک وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"اب بکنے کے لائق کوئی سامان نہیں رہا۔ زیور تو سب جا چکا اور راشن بھی ختم ہو گیا۔"

لیکن اس وقت ان بے تکی باتوں کا کیا مقام ہے" وہ جھلا گیا

یہ عجیب بات ہے کہ مرد جب "سہاگ رات" منانے کے موڈ میں ہو تو پھر اسے کوئی پریشانی یاد نہیں رہتی ــــ اس نے پھر سے بساط بچھانی چاہی، اس کے گلے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا

"سب ٹھیک ہو جائے گا ــ آؤ میرے گلے لگ جاؤ ــ"

لیکن اس نے محسوس کیا کہ اس کی دلہن کچھ کترا رہی ہے ــــ چھ سالوں سے جو انداز خود سپرگی اس میں رچا ہوا تھا، وہ کہیں کھو سا گیا ہے۔ وہ کچھ ڈری ڈری سی لگ رہی ہے۔ شاید حالات سے !!

اس نے بہت منانا چاہا لیکن وہ بیٹھ کر سسکتی ہی رہی وہ بھوکا ہی سو گیا ــــ نہ جسم کی بھوک مٹی نہ پیٹ کی ــــ،

دوسرے دن وہ حسب معمول بشاش تھا، اتنی پیاری بیوی سے وہ ناراض رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ باہر جانے لگا تو ترش یا لجاجت آمیز لہجہ میں بولی۔

"شام کو مجھے گھمانے لے چلئے گا!"

وہ اتنے پیار سے فرمائش کر رہی تھی کہ وہ یہ بھی نہ کہہ

سکا کہ "میری جیب میں ایک پیسہ تک نہیں ہے تمہیں باہر جانے کے لئے ایک روپیہ تو ہو ــــ" بہرحال اس کا دل توڑا نہیں جا سکتا تھا۔ وہ بے حد پیار سے بولا۔

"میری جان فرمائش کرے اور میں نا کہوں و شام کو تیار رہنا بچوں کو بھی لے لینا ــ"

شام کو وہ گھر آیا تو سب تیار تھے۔ نمود نے بڑے اچنبھے سے دیکھا کہ ثریا نے آج اپنی شادی والا سرخ، سرخ جوڑا پہن رکھا ہے، اتنے سالوں میں کوئی دوسری عورت ہوتی تو جانے کتنی موٹی ہو جاتی، لیکن چھ سالوں کے بعد بھی ثریا کے وہ جوڑا جوں کا توں برابر تھا ــ اس نے تعریفی انداز سے بیوی کو دیکھا اور چاقو کو ٹٹولا ــ

"چاقو رکھ لیا ہے نا ــ ؟"

ثریا سنجیدگی سے بولی۔

"ایسی بیوی ساتھ ہو تو چاقو رکھنا ہی پڑتا ہے"

وہ ہنسا ــ

"ایسی بیوی کے لئے چاقو رکھنا ہی پڑتا ہے۔"

وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑائی ــــ پھر، زور سے بولی۔

"مگر چلیں گے کہاں ــ ؟ بس کے کرائے بھر کے پیسے بھی تو نہیں ہیں ــ"

اس نے جیبیں تھپ تھپائیں ــ "ہاں پیسہ

تو ایک بھی نہیں ہے۔"

"تو پھر یوں کریں کہ سمندر کے کنارے چلتے ہیں پیدل پیدل نکل جائیں گے قریب ہی تو ہے۔"

"ہاں آئیڈیا برا نہیں ــــ جگہ اچھی ہے ــ۔"

"خودکشی کے لئے تو زیادہ ہی اچھی ہے ــ۔" وہ اپنی دھن میں پتہ نہیں کیا کہہ گئی ــ۔

جب وہ چاروں سمندر کی ٹھنڈی ٹھنڈی گیلی گیلی ریت پر بیٹھ گئے تو اچانک محمود نے ثریا کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اب مجھے تم سچ سچ بتا دو کہ تمہارے دل میں کیا ہے، یہ تمہارا کھڑا رہنا، پھر گھر سے چلتے وقت چاقو کے بارے میں پوچھنا ــ اور پھر یہ کہنا کہ سمندر خودکشی کے لئے اچھی جگہ ہے..... تم چاہتی کیا ہو؟ جانِ من مجھے سب کچھ بتا دو ــ دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا....

ثریا نے سکون کے ساتھ سانس لیا۔

"میں خود اسی لئے آپ کو یہاں لائی ہوں ــ تاکہ میں خودکشی کر سکوں ــ! یا آپ مجھے چاقو مار کر ہلاک کر دیں....."

وہ آنسوؤں پر قابو پانا چاہ رہی تھی اس لئے رک رک کر بول رہی تھی۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ جیسے شوہر کے ساتھ ایسی بھی اپنی بیوی کو اسی طرح چاہتا ہے جیسے پہلی شب ہو....."

"لیکن تم کچھ بتاؤ گی بھی....." محمود انتہا سے زیادہ

بے چین نظر آ رہا تھا۔

"میں ..... " وہ سسکی ..... "میں ابھی سب کچھ بتاتی ہوں .... اور وہ اس طرح سب کچھ کہتی گئی، جیسے چابی بھر دینے پر ریکارڈ بج اٹھتا ہے۔

"آج سے پندرہ دنوں پہلے کی بات ہے۔ میں نہا کر بالکنی میں بال سکھانے کھڑی تھی، سہ پہر کا وقت تھا، بھوکے بچوں کو میں نے ذرا سی شکر پانی میں گھول کر دودھ کے بہانے پلا کر سلا دیا تھا ——— میں مستقبل کے بارے میں سوچ رہی تھی جب ہمارے پاس بہت سے پیسے ہوں گے — بنگلہ ہوگا — کار ہوگی — فرنیچر۔ بہت سے نوکر — کسی بات کے لئے ترسنا نہیں پڑے گا۔ اور ہونٹوں پر خوشی کے نغمے ہوں ...... اور شاید انہیں خوش آئند خوابوں نے میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دی اپنے خوابوں سے میں اس وقت جاگی۔ جب نیچے کار میں سے ایک خوش پوش نوجوان اتر کر سیدھا اوپر ہی چلا آیا ——— میرا ہاتھ تھام کر وہ مجھے کمرے میں لے گیا۔ اور ایک ایک کر کے میرے سارے کپڑے اتارتا گیا ——— بیچ بیچ میں وہ کہتا رہا۔ "ڈارلنگ ——— کپڑے تو بدصورت عورتیں اپنی بدصورتی چھپانے کو پہنتی ہیں .... تم جیسی حسین عورتوں کو تو ننگا ہی رہنا چاہیئے۔"

مجھے پتہ تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔ کیونکہ میں کوئی بچہ نہیں تھی۔ ایک بیوی تھی جس نے چھ سال کی

کئی خوبصورت راتیں اس انداز سے گزاری تھیں۔ لیکن اس وقت میرے ذہن میں صرف وہ بچے تھے جو شکر ملا پانی پی کر سونے ہوئے تھے جو جاگ کر مجھ سے روٹی کا، مطالبہ کرنے والے تھے۔

جن کا باپ شام کو نوکری کی ناکام تلاش کے بعد بھوکا ماندہ گھر واپس آنے والا تھا ــــ گھر جو مالک مکان کے تقاضوں سے ہاتھ سے جانے ہی والا تھا ــــ

ایسے میں میں نے کوئی مزاحمت نہ کی ــــ مجھے رونا تو اس وقت آیا جب وہ دس دس کے نہیں ..... سو سو کے دو نوٹ میرے ہاتھوں میں یہ کہہ کر تھما گیا کہ ــــ

ڈارلنگ تم جیسی حسین اور پیاری گڑیا کے لئے یہ دو سو روپے کوئی حقیقت نہیں رکھتے تم اسی طرح مسکراتی ہوئی بالکنی میں کھڑی رہو تو میں قسم خدا کی روز روز نہ پھیرے لگاؤں .....

پھر جب وہ چلا گیا تو میں راشن کارڈ لے کر سیدھی راشن کی دوکان پر گئی ــــ دال چاول، آٹا گوشت سبھی چیز آگئی ــــ میں نے سارے دن کے پیٹ کا دوزخ بھر دیا ــــ لیکن خود ایک ایسے دوزخ میں جلنے کے لئے زندہ رہ گئی جس کا حال سوائے میرے کوئی نہیں جان سکتا تھا ــــ میں نے یہ سارے دن کیسے گزارے ہیں؟

اس کا دکھ میں کیا کہوں؟ آپ کے ڈر سے پڑوسن

سے قرض کا ڈھونگ رچایا اور باقی کے روپے ابھی تک صندوق میں پڑے ہیں....."

ریکارڈ ختم ہو چکا تھا — بڑی دیر خاموشی چھائی رہی —

دونوں بچے کھیلتے کھیلتے دور نکل گئے تھے۔ پھر ثریا نے خاموشی توڑی۔

"اسی لئے میں نے چاقو کے بارے میں پوچھا تھا آپ جو اتنے حساس اتنے حاسد تھے کہ ہر رات مجھ سے پوچھتے تھے کہ

"تم میری ہی رہوگی نا؟"

وہ شوہر یہ کیسے برداشت کر سکتا ہے کہ اسکی بیوی نے کسی اور کا پہلو گرمایا ہو.....

اور ...

سمندر پر آنے کے لئے میں نے آپ کو یوں اکسایا تھا کہ .....

ممکن ہے آپ کو دو بچوں کی ماں پر رحم آجائے اور آپ ہاتھ چلا سکیں تو میں سمندر میں کود کر اپنی زندگی ختم کر لوں......

محمود منہ پھیرے بیٹھا سب کچھ سن رہا تھا۔ ثریا خاموش ہوئی تو بڑی دیر کے بعد وہ بولا

"کیا تم اسی طرح مسکراتی ہوئی بالکنی میں ہر روز نہیں کھڑی رہ سکتیں میری جان —؟"

•• ——

توبہ توبہ

رانیں جب انتہائی گوری ہوں، مکھن کی طرح چکنی ہوں ملائی کی طرح نرم ہوں، بجلیوں کی طرح پھڑکتی ہوئی ہوں اور شلوار کا رنگ گہرا نیلا ہو اور پہننے والی اٹھارہ سالہ نوجوان لڑکی ہو۔ اور یہ منظر دیکھنے والا چھبیس ستائیس سالا بھرپور جوان ہو تو ؟؟

سمی نے نئی تراش اور جدید ترین فیشن کا لہریے دار پٹوں کا تنگ فراک تو اپنے جسم پر چڑھا لیا تھا اور جب تنگ پائنچوں والی شلوار سے دھینگا مشتی ہو رہی تھی کہ اچانک ریاض کمرے میں آن ٹپکا۔ ایک لمبی سی "اوئی" کہہ کر سمی نے اپنے آپ کو چھپانے ڈھکنے کی کوشش میں پاس پڑا نائیلون کا دوپٹہ اٹھایا اور رانوں کے گرد لپیٹ لیا۔

یہ منظر اور بھی توبہ شکن تھا، کم بخت دوپٹہ بھی گہرا نیلا ہی تھا۔ یہ سمی نامراد کو کچھ خبط بھی تھا کہ میچنگ کرتے ہوئے کپڑے پہنے۔

گہرے ہرے، پیلے، اودے، دھانی، لال، گلابی کپڑوں کے ڈھیر کے ڈھیر اس کی الماریوں اور صندوقوں میں بھرے پڑے تھے۔

اور اب نیلے نیلے پیرہن میں دھڑکتا تڑپتا جسم لئے وہ "اوئی، اوئی" کرتی کھڑی تھی مگر یہ سدھ نہ

ہو رہی تھی کہ بازو لٹکتے بردے کے پیچھے ہی چلی جائے
ریاض پہلے تو پلکیں جھپکا جھپکا کر یہ قاتل منظر دیکھا
کیا، پھر جیسے ہوش میں آکر چلنے ہی کو تھا کہ سمی،
تیزی سے بولی۔
"اللہ رجو بھائی ـــ قسم اللہ کی بڑے بے
حیا ہو ـــ، ٹلتے بھی نہیں یہاں سے، توبہ
توبہ ـــ"
وہ جھوٹ موٹ اترائی
ایک دم ریاض پھٹ پڑا
"میں بچہ نہیں ہوں جی جو مجھے رجو بجو کہتی
پھرو، ہاں میں....."
بس اس کے الفاظ زبان ہی پہ سرک کر رہ
گئے
"اور خبردار۔"
وہ بڑی ہمت سمیٹ کر الفاظ چبا چبا کر بولا
"جو کبھی میرے سامنے توبہ توبہ کہا ـــ ہاں میں کہے
دیتا ہوں جی سمی بیگم۔"
اور ایک دم وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔
"توبہ توبہ ـــ"
وہ بڑبڑاتا جا رہا تھا۔
"توبہ توبہ۔ اس توبہ نے تو میری جان لے لی
توبہ توبہ، ہونہہ، بڑی آئیں توبہ توبہ۔"
جیسے بادل اڑتے ہیں، ایسے بہت سارے ماہ و سال

بیر لگا کر اڑے اور اس منزل پہ پہنچے جب ریاض،
رجو چھ سال کا تھا۔

کبھی نیکر پہنتا، کبھی اس سے بے نیاز ہو جاتا، کبھی تو
بالکل ہی ننگا رہتا، کبھی موج میں آکر قمیص ہی گلے میں
لٹکا لیتا۔ اور ان دنوں وہ پورے گھر بھر میں کسی
قدر بے ضرر مانا جاتا۔

اس قدر بے ضرر کہ منجو باجی، جو سارے گھر بھر
کے بچوں سے بھی گئی گذری اور پدی تھیں، بنانے کو بڑے
دالانوں سے لگے بڑے سارے حمام میں جاتیں تو مارے
ڈر کے اسے ساتھ لیتی جاتیں۔

- وہ اپنی نیلی پیلی گڑیاں، ہرے لال کپڑے لئے جاتا

پھر اس دن الو سے لڑائی لڑائی میں وہ سارے کپڑے اور
گڑیاں ہار گیا اور منجو باجی گرمی سے بوکھلا کر باتھنگ گاؤن
اٹھائے حمام میں گئیں تو اسے خالی ہاتھ ہی پہریداری
کو جانا پڑا۔

(کم بخت منجو باجی۔ جانے کاہے کا ڈر لگتا تھا انہیں)
منجو باجی مل مل کر نہاتی رہیں اور وہ دیوار کی طرف
منہ کئے بیٹھا رہا۔

پھر دیوار کو دیکھتے دیکھتے اس کا جی اوب گیا تو اس
نے ذرا سی ذرا گردن پھیری۔

باپ رے ؛؛ وہ بھی منجو باجی کی طرح ڈرنے لگا۔
مگر پھر ہمت سمیٹی۔

ہنجو باجی شادر کے نیچے کھڑی تھیں۔ دہکتی چمکتی گولائیوں میں سے پانی بھی جیسے سہم سہم کر، جھجک جھجک کر گر رہا تھا۔

سنہری روپہلی چھوٹے بڑے موتی پھر بھی ان کے، ابھاروں پر اٹک ہی جاتے۔

اور پھر ان کے بہت، بہت، بہوت ہلیے بال ساری پیٹھ پر چلے ہوئے تھے۔

اور پھر موتی سہمے سہمے۔ بال بکھرے بکھرے اور ان کی نرم اور ملائم جلد، جو صابن کے رگڑے کھانے سے سرخ پڑ گئی تھی۔

اور پھر — اور پھر — ؟

اسے یہ منظر خدا کی قسم بہت ہی اچھا لگا، بہت ہی اچھا لگا — !

اسے غصہ آنے لگا کہ اتنا سارا زمانہ وہ کنچے اور گولیاں کھیلنے یوں ہی بتا آیا، الّو کا پٹھا ہیں۔

ایک دم تولیہ لینے کو منجو باجی نے ہاتھ بڑھایا اور چہرہ بھی ادھر کو پھیرا۔

رجّو اپنی گنجوں جیسی آنکھیں کھولے۔ بنا پلک مارے تصویر بہ حیرت بنا قدرت کی داد دے رہا تھا۔

تولیہ اپنے جسم کے ارد گرد لپیٹتی ہوئی وہ ایک ادائے تبسم کے ساتھ بولیں۔

"توبہ توبہ!"

جیسے کسی نے اس کے گریبان میں سے برف کی ڈلی اندر چھوڑ دی ہو۔

وہ چونکا؛

اس طرح چونکا کہ اس کا انگ انگ لرز گیا۔ وہ جی ہار کر یوں ہی بیٹھ گیا۔

منجو باجی باتھ گاؤن پہن پہن چکیں تو اسے اٹھاتی ہوئی بولیں۔

"رجو ایسے کسی کو نہاتے ہوئے دیکھنا یا ننگی عورت کو دیکھنا بہت، بہوت بری بات ہے۔ اب نئے دیکھو گے؟"

اس نے سہم کر منجو باجی کو دیکھا اور بڑی سعادتمندی سے دونوں ہاتھ گاؤن پر مارتے ہوئے کہنے لگا۔

"توبہ توبہ، اب چھے نئیں، توبہ توبہ، اب چھے نئیں، توبہ توبہ ——"

اور اس کی نگاہ جھکتی گئی —— جھکتی ہی گئی ——

پھر کتنے ماہ و سال گذرے —— کتنی گرمیاں، کتنے جاڑے،

گرمیوں کی ہر گذرنے والی رت رجو کو ایک سال بڑا کر جاتی —— مگر گھر والے یہ بھی دیکھتے کہ کبھی تو رجو نہانے کی خاطر دالانوں والے حمام کی طرف نہ پلٹا۔ اب ایسا بھی کیا بیر وہ تھا۔

لڑکا بیس اکیس سال کا ہو بھی جائے تو گھر سے نکال کر تو نہیں پھینک دیتے نا۔

کبھی شادی بیاہ کے ہنگاموں میں مردانہ بالکل
اٹاٹ بھر جاتا اور ایسے موقعوں پر کوئی ر جو سے
کہتا ــــ ،
" میاں تم تو گھر والے ہی ہو ، اپنے زنانی حمام
میں آکر نہالیا کرد نا۔ اب یہ تو ہونے سے رہا کہ غیر
مردوے گھروں میں جھانکتے پھریں ۔ "
تو وہ سوچتا ــ " توبہ توبہ "
ریاض بی، اسے میں آیا ، لڑکیاں ایک سے ایک تیکھی
اور پڑھائی چور ، ـــ !
اور ریاض نے تو اکنامکس میں وہ قابلیت دکھائی
تھی کہ پروفیسر صاحب خود ایک دن ابا کے پاس آئے
تھے کہ چھوکرے کو لندن بھجوا ہی دیں ۔
جب کبھی کسی نے کہا کہ میاں ذرا لڑکیوں کو کچھ
سکھا دیا کرو ، کچھ بتانے سکھانے سے علم تو گھٹنے سے
رہا ــــ ،
وہ سوچتا " توبہ توبہ ! "
شہر میں کبھی نمائش لگتی اور لڑکیاں اس کے منہ
آتیں تو ......
اس تصور سے ہی اس کے پسینہ آنے لگتا کہ
وہ شمو ، ٹمو ، اللانی فلانی کے جھرمٹ میں کھڑا
ہے ــــ :
وہ سوچتا ؛ " توبہ توبہ ! "
گھر میں کوئی مہمان اترے ، یا یہ خود کہیں ماں باپ

کے ساتھ جاتا ـــــ تعارف کی نوبت آتی بھی تو اس کی جھکی جھکی نگاہ اوپر اٹھنے کا نام نہ لیتی۔

لڑکی کو سلام کر دوں؟ سوچتا،

"توبہ، توبہ ـــــ"

بی، اے چھوڑ ایم اے پاس کر لیا نوکری والا بھی ہو گیا۔

پھر مٹھی روپے اماں جان کی جھولی میں بھی لا کر ڈالنے لگا ـــــ،

لیکن ـــ؛

شادی کی بات جب کبھی ماں نے، خالہ نے، چھیڑی،

اس نے دل ہی دل میں سوچا،

"توبہ، توبہ ـــــ"

ریاض محمد عرف رجو اس قدر خوب رو تھا، اتنا دل کش یا پھر بقول سمیٰ اتنا ہینڈسم کہ بس ایک گھڑی دیکھنے کی چیز ـــ!

"اللہ رجو بھائی اس قدر اسمارٹ، ایسے اسپورٹنگ ہیں کہ بھئی پوچھو مت ـــ جانے وہ کیا سوچتے ہیں ـــ"

لڑکیوں میں کبھی ریاض کا ذکر نکلتا تو بس، اس کے حسن پر ـــــ،

سب کا متفقہ فیصلہ تھا کہ نمبر ایک مغرور ہے،

اپنے حسن کے غرور میں چور رہے۔ یہی تو کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا، ورنہ یہاں تو ایک سے ایک "اسپورٹ" لڑکی موجود ہے۔

پھر بھی بہتوں کا خیال تھا کہ اگر کبھی رجو کی نظرِ انتخاب پڑی بھی تو سمی پر ہی پڑے گی۔

وہ نامراد دن رات ہیرو ئن بننے کے خواب دیکھا کرتی، کبھی تنہائی میں رجو مل گیا تو کیا کرے گی؟

ہائے بات کرنی بھی نہ سوجھے گی، تب بھی رجو بھائی ہی کہے گی؟ یا ریاض کہہ کر دم سادھ لے گی۔ مگر قسم لے لو جو ریاض کا سایہ بھی ادھر ادھر کسی نے دیکھا ہو ــــ

بس کمرے تک اس کی دنیا محدود تھی۔ وہ تو سمی کے کمرے میں یوں چلا گیا کہ بس اسے ہارڈی کا ناول پورا کرنا تھا، جو جانے کس بھونک میں سمی، اٹھالے گئی۔

اب بھلا اسے کیا معلوم تھا کہ کتاب لانے کو جائے گا اور وہاں ــــ!

"توبہ، توبہ ــــ" وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا ــــ؟

ادھر سمی کو وقتی طور پر تو بڑی شرم آئی، "اے ہے اللہ آخر رجو بھائی کیا سوچیں گے ــــ!

ایسے ہی بنا دروازہ بھیڑے کپڑے بدلا کرتے ہیں ۔ ! مگر انہیں حق بھی کیا تھا کہ کسی کے کمرے میں یوں چلے آتے ۔ ! اور ایسی ہی الٹ پلٹ ہزار باتیں وہ سوچتی رہی۔

پھر ایکا ایکی جگنو کی مانند ایک خیال اس کے ذہن میں چمک اٹھا ۔ کیا ۔ کیا ۔ وہ اب یہ نہ چاہیں گے کہ ان کی ہونے والی دلہن بھی ایسی ہی گوری چمک دار ہو ۔ ؟

مگر رجو نے تو کوئی نوٹس ہی نہ لیا، سمتی کی ٹانگوں کو تو اس نے اتنی بھی اہمیت نہ دی جتنی ایک بار بکری کی ٹانگوں کو دی تھی۔

نوکر خانے میں ایک دن ماماؤں کے پوتے ایک بکری پکڑ لائے تھے اور سب مل کر اس کا دودھ دوہنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔

اور بکری تھی کہ بس ٹانگوں سے پوتوں کو جھاڑ رہی تھی۔

رجو کو بڑی ہنسی آ رہی تھی اور وہ بڑے چاؤ اور انہماک سے دیکھ رہا تھا کہ بکری پچھلی ٹانگوں سے کس مزے سے دولتیاں جھاڑ رہی ہے۔

ہائے بے چاری سمتی ؛ بکری سے بھی گئی گذری ہو گئی ایسے موقعے پر جو ہوتا ہے وہی ہوا۔

یعنی بالکل وہی ہوا کہ بے چارہ رجو جو نہیں تھا، وہ سمجھ لیا گیا اور جو تھا وہ کسی نے نہ سمجھا،

اور اب تو لوگ باگ رجو میاں کی والدہ کی قسمت پر ترس کھانے لگے تھے کہ کس قدر خوبصورت، سجیلا اور خوب رو، پڑھا لکھا لڑکا اور ——

سمی بھی اپنی جگہ صبر کر کے بیٹھ گئی، اس بات سے کم از کم رجو کو اتنا اطمینان تو ہوا کہ اب کوئی اس کے آگے شادی کی بات چھیڑتا ہی نہ تھا۔

وہ مزے سے آفس جاتا۔ مہینے کے انت پر ڈھیر سارے کپڑے سلواتا۔ برل کریم لاتا، بڑھیا پوڈر اور ٹائیاں لاتا اور بس مگن تھا۔

مگر ایک دن کیا ہوا کہ رجو نے آفس جانے کے لئے، اپنی سوٹر سائیکل نکالی،

ابھی وہ جانے ہی لگا تھا کہ اسے یاد آیا کہ پین میں وہ انک ڈالنی تو بھول ہی گیا ہے؟

وہ بجائے پورچ کے پچھلے زنانی دروازے سے آنے لگا کہ یہ راستہ نسبتاً چھوٹا تھا — اور اسے جلدی جانا تھا۔

ٹائم کا وہ بہت ہی خیال رکھتا تھا کہ آفس دیر سے نہ پہنچوں — ایسے کیریر خراب ہوتا ہے۔ وہ راہداری سے آنے لگا تو صنو پر جھاڑو دیتی جھپک، جھپک ادھر ادھر ہاتھ مار رہی تھی۔

رجو جلدی جلدی قدم اٹھانے لگا کہ کم بخت پین عین اس جگہ گرا جہاں صنو بر کھڑی تھی۔

وہ پین اٹھانے کو جھکا —!

اور جب وہ دھیرے دھیرے اوپر اٹھا تو اس کے جسم میں ننھے ننھے سنپولیے سے رینگنے لگے۔ اس کی ناک عجیب سی خوشبو بھر گئی۔

یہ خوشبو سراسر صنوبر کے جسم میں سے آ رہی تھی اس کے اپنے جسم کی،

جھاڑو لگانے سے اس کا جوان جسم بھبھک اٹھا تھا۔

پسینے کے قطرے یہاں وہاں نمایاں ہو گئے تھے۔ سیدھے ہاتھ کی آستین شانے کے پاس سے پھٹ گئی تھی۔

اور گندھی ہوئی سوجی کی رنگت کا مہکتا دمکتا گوشت جیسے رجو کو زبان چڑھائے جا رہا تھا۔

رجو اتنے برس کا ہو گیا تھا۔ اس نے عورت کو اتنے قریب سے نہ دیکھا تھا۔

اور پھر یہ عورت؟

اسے دیکھ کر توبہ توبہ! کہنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ یہ تو سات پردوں میں چھپی ہوئی عورت تھی۔ سر پہ پلو، کمر تک بلاؤز، ٹخنوں تک ساڑی۔

بس ایک شانے کے پاس کا گوشت تھا جو بدہ رہ کر سورج کی طرح جگمگ جگمگ کر رہا تھا، سورج کو مارو گولی جی ـــ!

وہ گومست ہوا جا رہا تھا اس خوشبو سے۔ جو بظاہر خوشبو نہیں تھی ـــ۔ مگر دنیا کے ہر عطر پر بھاری

تھی۔
صنوبر جھاڑو لگاتی اس سرے سے اس سرے پر چلی گئی،
اس نے مڑکر دیکھا تک نہیں رجو کا سارا وجود جلتے چولہے پر دھرا توا بن گیا۔
اس نے اپنی پوری طاقت سمیٹ کر پاؤں کمرے کی طرف بڑھائے اور عثمان کو آواز دے کر ڈوبتے لہجہ میں بولا۔
"عثمان میری موٹر سائیکل اندر رکھ دے میں آفس نہیں جاؤں گا.... میرا سر اچانک درد کرنے لگا ہے۔"
رجو کو شرم تو بہت آئی ـــــ۔
مگر اس نے اسے طاق پر رکھنے میں ہی بھلائی سمجھی اور اماں سے بالکل اسی لہجہ میں شادی کی بات کہہ دی:
جیسے نئے سوٹ کا کپڑا خریدنے کی بات کہی ہو۔
"اماں آفس میں دوست احباب بہت مذاق بناتے ہیں، آپ میری شادی کر دیجئے۔"
اماں بے نصیب کو تو اس دن کی آس ہی نہیں تھی انہوں نے چھوٹتے ہی سخی کا نام پیش کر دیا۔ رجو کو سخی، نخی، رتی، کچی، کسی سے غرض نہ تھی، اسے بس، عورت سے غرض تھی۔
ایک خوشبودار عورت سے چھپی ڈھکی عورت سے ـــــ!

رجو جب دلہن کے کمرے میں داخل ہوا تو کمرہ عطر، لوبان، پھولوں اور طرح طرح کی خوشبوؤں سے مہک رہا تھا

سجے سجائے پلنگ پر سمی ـــ ایک عورت سر جھکائے بیٹھی تھی جو سر سے پیر تک ڈھکی ہوئی تھی، جس کا ایک بال تک بھی نظر نہ آ رہا تھا۔

"اچھا ہی ہوا جو یہ ڈھکی ہوئی ہے" رجو نے عجیب بے معنی سی بات سوچی۔

اگر ـــ اگر ـــ مگر اس وقت وہ خود کو اگر مگر کے چکر میں ڈالنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

کتے جیسے کچے گوشت پر لپکتے ہیں، ایسا وہ پلنگ کی طرف لپکا اور ہاتھ بڑھا کر سوئچ آف کر دیا۔

ایسی جان لیوا گرفت تھی کہ سمی چوں بھی نہ کر سکی تھی ـــ!

مگر دوسری صبح ہر چند کی نڈھال نڈھال سی تھی، اس کے چہرے کی جلد بتا رہی تھی کہ وہ سچ مچ ہیروئن بن گئی ہے۔

دوسرے دن جب سمی کی ذرا شرم ٹوٹی تو اس نے کنکھیوں سے رجو کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

مگر پوچھنے سے پہلے اس کے دل کو ذرا دھکا سا لگا ـــ

شادی کے دوسرے دن کیا دولہے ایسے ہی چپ چپ اور روٹھے رہتے ہیں؟

جی کڑا کر کے وہ پوچھ ہی بیٹھی
"آپ کو مجھ سے شادی کا خیال کیسے آیا؟"
پھر تھوڑی دیر خود ہی رک کر بولی۔
"میں سمجھ گئی، آپ نے اس دن مجھے بری حالت میں دیکھ لیا تھا نا؟"
اور وہ بالکل معصومیت سے ہنس دی۔
رجو کو اس سے ایسے بیہودہ سوال کی ہرگز توقع نہ تھی،
اور اگر ایسا ہی وہ ٹانگوں پر عاشق ہو جانے والا ہوتا تو رات بھر میں اس کی ٹانگیں.... خوناں خون ہو گئی ہوتیں،
مگر اس نے تو کمرے میں داخل ہوتے ہی لائٹ آف کر دی تھی اور سمی کی ٹانگیں تو کیا چہرہ تک بھی نہ دیکھا تھا۔ اور جو ہونا تھا وہ ہو ہی گیا تھا کہ یہ ہونا ناگزیر تھا۔
مگر ۔ مگر اسے ہر شے میں کسی شے کی کمی کیوں، محسوس ہو رہی تھی؟ وہ بے نام سی شے کیا ہو سکتی تھی۔
۔ کیا ۔ کیا ۔؟
اتنی جلدی یہ سب ہو جائے گا، وہ تو خواب میں بھی نہ سوچ سکا تھا۔
اسے بڑی شرم آئی جب تھوڑے دنوں بعد سمی نے اسے بتایا کہ وہ باپ بننے والا ہے۔
اسے یہ سب کچھ بڑا عجیب عجیب سا لگا، اور کھوئے

کھوئے ۔۔۔۔ پن کا وہ احساس کچھ اور بھی شدید ہوتا گیا۔

سمی شروع دن سے محسوس کر رہی تھی کہ رجو کچھ کھویا کھویا سا لگتا ہے۔ مگر کیوں ۔؟ یہ وہ کبھی سمجھ نہ پائی۔

وہ اس کمی کو اپنے حسن، اپنے وضع وضع کے نئے لباسوں سے پُر کر دینا چاہتی تھی۔ اور کرتی بھی تھی ۔۔۔۔!

ویسے ہی اس کے پاس نت نئے تراش خراش کے لباسوں کے ڈھیر تھے، مگر اس نے اور بھی بڑھیا بڑھیا لباس سلوائے۔

کھلے گلے کے فراک، نیچے گلے کے شرٹ، ایسے گریبان کہ چاند سورج چمکتے نظر آئیں، تنگ بلاؤز سمی ماڈل بن گئی، سہیلیاں مذاق سے کہتیں۔

"فیشن پریڈ میں چلی جا، فرسٹ پرائز نہ ملے تو ہم سے کہنا۔"

اور اب سمی ماں بن رہی تھی، خوبصورت کپڑے پہننے والی، چمکتا لبھاتا سنگھار کرنے والی سمی ماں بن رہی تھی

"یہ تو زیادتی ہے"

رجو نے خود ہی ایک دن دل میں سوچا، سراسر زیادتی ہے کہ میں اسے بھرپور محبت نہ دوں وہ اسے چاؤ سے کھانے کو لے جانے لگا۔ پکچر کے بہانے سیر کو لے گیا

سمی کو ذرا دکھ سا بھی ہوا۔

ہے نامرد کی ذات، اولاد کی آمد کے آثار نے ہی اتنا بدل دیا، مگر چند دنوں میں سمی کو یہ سب کچھ بھی پھیکا پھیکا اور بناوٹی لگنے لگا۔

لیڈی ڈاکٹر نے اسے سیڑھیاں چڑھنے سے منع کر دیا تھا۔ گرم ٹھنڈی چیزوں کے لئے منع کر دیا۔ اور بھی "دوسری باتوں" کے لئے احتیاط بتائی تھی۔

وہ تو ڈاکٹرنی نے کہا تھا سو وہ تو عمل کر رہا مگر پھر بھی سمی کو اس لمحہ کی حسرت ہی رہ گئی جب کہ وہ ـــــ سمی کو تو سوچتے بھی شرم آتی تھی مگر وہ کیسے اپنے دل سے چھپاتی؟ اس کی کتنی ہی سہیلیوں نے شرم اور فخر سے تمتماتے ہوئے چہروں کو سرخ سرخ دوپٹوں میں چھپاتے ہوئے بتایا تھا

"کوئی حد بھی ہوتی وحشت کی ـــــ قسم اللہ کی، آستین تار تار ہو گئی تھی میری"

"اللہ ہی سمجھے ایسے بے شرم سے، سارا لباس بچ گیا"

سمی کا لباس عروسی ایسا نیا تھا، جیسے ابھی درزی کے ہاں سے سل کر آیا ہو،

اور ایک دن رجو باپ بھی بن گیا، میٹرنٹی ہوم کے بیس روپے روزانہ والے کمرے سے نکل کر جب اس کی ماں نے بتایا ـــــ،

"رجو تجھے لڑکا ہوا ہے"

تو اسے عجیب سا لگا کہ باپ بھی بن گیا مگر لوگوں نے اس کا بچکانہ نام رجو نہ بدلا، پر نہ بدلا۔ بھلا کتنا عجیب لگے گا کہ اس کے بچے کی موجودگی میں اماں اسے رجو کہہ کر پکاریں؛ یہ بہت غلط چیز ہے، اس نے جھلا کر سوچا، بچپن کی یادوں کو بچپن کے ساتھ ہی ختم ہو جانا چاہیئے۔ میں اپنے بیٹے کا کوئی NICK NAME نہیں رکھوں گا، اس نے بہت ہمت کے ساتھ جیسے ایک فیصلہ کر لیا۔

سمی بچے کو لے کر ہاسپٹل سے پلٹی تو زرد زرد سی تھی، تھکی ہاری، پتہ نہیں کاہے کی تھکن اسے گھیرے بیٹھی تھی، مگر اس کے چہرے پر نور سا چھا گیا تھا۔

یہ زردی اس زردی سے مشابہ تھی جیسے چاند کے گرد زرد ہالہ ہو، رجو کو سمی اب پہلے سے کہیں زیادہ حسین لگتی تھی۔

اس کے اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، بات چیت تک کرنے کے انداز میں ایک وقار اور بانکپن پیدا ہو گیا تھا۔ وہ جب رجو کی طرف بیٹھ کر کے بچے کو دودھ پلانے بیٹھتی تو رجو کو اس کے مڑ مڑ کے بات کرنے کا انداز بہت ہی بھلا لگتا۔

کیا عورت بچہ پیدا کرنے کے بعد زیادہ خوبصورت لگتی ہے، یا صرف اسی کو لگ رہی ہے؟"

بچہ بڑی جلدی جلدی بڑھ رہا تھا۔ پہلے جو کرتے اسے ڈھانپ دینے کو کافی ہو جاتے تھے اب اس کی

ٹانگوں کو ڈھانکنے میں بھی ناکام رہتے تھے۔

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

بچے کی
کی بہ مسہوتری کے ساتھ ساتھ سمّی نے کام کاج میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔

کبھی تو وہ مشین پر بیٹھ کر کھر کھر کپڑے سی رہی ہوتی، کبھی بچے کے کپڑے دھوتی نظر آتی، رجو اسے اتنے لگن سے کام کرتا دیکھ کر ہنس کر پوچھتا۔

"سمّی تم نے اپنے ذمہ اتنے سارے کام کیوں لے رکھے ہیں؟"

سمّی مسکرا کر جواب دیتی

"اپنے بچے کا کام خود کرنا مجھے بڑا اچھا لگتا ہے۔"

"مگر اس طرح تم نے خود اپنا خیال رکھنا چھوڑ دیا ہے نا، کبھی تم سوچتی ہو کہ پہلے تم کس طرح ماڈل بنی پھرتی تھیں اور خوشبوؤں میں بنائی رہتی تھیں!"

سمّی کا حلق سوکھنے لگتا۔ جی چاہتا کہہ دے

"تب بھی آپ نے کون جان نچھاور کر دی تھی مجھ پر، میں تو ایسے ہی نصیب لائی تھی کہ ساری خوشیاں نصیب ہوتے بھی دل میں بے نام سی کسک پالا کروں۔"

خود رجو نے بھی تو محسوس کیا تھا کہ وہ سمّی کو ٹوٹ کر پیار نہیں کرتا۔ اس کا کوئی انداز جان چھڑکنے والا نہیں کہلایا جا سکتا۔

وہ خود مجبور تھا، وہ ایسے جال میں پھنسا تھا جو بظاہر جال نہ تھا مگر پھر بھی وہ نکل نہ پاتا تھا۔

اس دن رجو آفس سے لوٹا تو ستی خلافِ معمول بری طرح چڑی ہوئی تھی۔

آنگن میں ننھے نے خوب ساری مٹی کا ڈھیر کیا ہوا تھا اور ہر طرف کھلونے ہی کھلونے۔ اور وہ خود اس مٹی اور کیچڑ سے دھول میں اٹا بالکل سادھو مہاتما لگ رہا تھا۔

ستی اپنے نصیب کو کوس رہی تھی۔

"کنوارپن کی زندگی بھی کیا زندگی ہوتی ہے خداوند کوئی فکر نہ جھمیلا، یہاں تو کمبخت اٹھاتے گھٹ گھٹ ہی سے اولاد نصیب میں بندھ گئی۔

سارے مزے ہوا ہو گئے۔ گو موت کرو، جھاڑو دھونک کرو، نہلاؤ دھلاؤ، کچھ بھی کر مرو مگر یہ حرامزادہ گندے کا گندہ، اگر پہلے سے ذرا بھی خیال آیا ہوتا تو ایسی شادی کو دور ہی سے سلام کر دیتی"

وہ چڑ چڑ کر جھاڑو سے دھول اڑاتی جاتی تھی اور ننھے پر چڑتی جاتی، ایک دم رجو گھر میں داخل ہوا، وہ چڑے جا رہی تھی۔

"کم بخت نصیبوں میں جو سوچا بھی نہ تھا، وہ آگیا کبھی کا ہے کو جھاڑو تھامی ہوگی، یہ حرامزادہ تو مجھے کھا کر ہی چین لے گا۔"

رجو ہنس کر اسے چڑانے کو بولا۔

"بس ایک ہی میں گھبرا گئیں، خود ہی نے اسے بگاڑا ہے، یاد ہے کیسے کیسے چاؤ چونچلے تھے اس کے، ایک سال میں گالیوں تک نوبت پہنچ گئی۔"

اور وہ آگے بڑھا اور بولا

"لاؤ جھاڑو ادھر دیدو۔ ماشاءاللہ سے گھر میں بہت نوکر ہیں ــــ تمہی نے ہر کام اپنے ذمہ لے لیا ہے تو اس کا کیا علاج؟"

سمی نے تیزی سے ہاتھ پیچھے کر لیا اور خود بھی پرے ہٹ گئی۔

"بیٹھئے بھی، اب آپ جھاڑو کو بھی ہاتھ لگائیں گے؟"

وہ جھاڑو والا ہاتھ پیچھے کر کے، یونہی کھڑی رہ گئی۔

رجو گرتے گرتے بچا۔

اس کے جسم میں ہزاروں بڑے چھوٹے سپنو لیئے کلبلانے لگے۔

ہمیشہ سجی سنوری، خوشبوؤں میں ڈوبی، بڑھیا لباس میں ملبوس رہنے والی سمی آج ایک پرانی دھرانی ساڑی میں لپٹی کھڑی تھی۔ بلاؤز کی آستین شانے کے پاس سے مسک گئی تھی گرد سے بچنے کو اس نے پلو سر کے گرد لپیٹ لیا تھا۔

جھاڑو نے اور الجھنے کی وجہ سے اس کے جذبات میں ابال سا آگیا تھا اور گردن اور چہرے پر پسینے کے شبنمی قطرے پھوٹ آئے تھے۔

اور ایک خوشبو، جو خوشبو تھی بھی اور نہیں بھی، اس کے جوان اور بھرپور جسم سے نکل نکل کر رجو کے نتھنوں میں ایسے پیٹھ رہی تھی کہ ہر لمحہ وہ گر پڑنے کو ہو رہا تھا۔

وہ جیسے خواب میں بڑھا اس کے قریب ہو کر پھٹے بلاؤز میں سے جھانکتے گوشت کو یوں دیکھنے لگا، جیسے سوچ رہا ہو کہ آستین میں سورج کیسے آ سکتا ہے ——؟

سمی تڑپ کر پیچھے ہٹی، ایک دم اسے اپنی ہیئت کا خیال آیا، بڑے تجوب اور شرمسار لہجہ میں بولی۔

"میں نے صفائی کے خیال سے یہ پھٹے کپڑے پہن لئے تھے، سوچا تھا جلدی جلدی جھاڑ جھوڑ کر کپڑے بدل لوں گی، آپ چلے آئے، آج تو آپ وقت سے کچھ پہلے ہی چلے آئے ——...

ہائے؛ مجھے کتنی شرم لگ رہی ہے، بھلا آپ کیا سوچتے ہوں گے"

اور وہ جھاڑو پھینک کر بھاگنے لگی۔

رجو نے لپک کر اسے باہوں میں سمیٹ لیا ——،

مدہوش کر دینے والی خوشبو کا ایک ریلا اس کی ناک میں گھس گیا۔

اور وہ بالکل وحشیوں کی طرح سمی کو بھنبھوڑنے لگا۔

کبھی وہ اس کے گال پر کاٹ کھاتا، کبھی ہونٹوں کو اس بری طرح چوسنے لگتا کہ سمی کو لگتا کہ اس کا دم نکل جائے گا۔

"توبہ توبہ"

سمی ہانپ کر بولی

"کچھ خیال تو کیجئے آنگن میں اور پھر ننھا"

رجو نے دیوانوں کی طرح جھپٹ کر اس کے ہونٹوں کو اپنے ہونٹوں سے چپکا لیا۔

وہ ایک ایک کر کے اس کے کپڑے نوچ، نوچ کر پھینکتا جا رہا تھا۔ دھول مٹی میں اٹی سمی نے بڑی بے بسی سے کہا۔

"توبہ توبہ رجو"....."

مگر ریاض نے اسے بات کرنے کی مہلت بھی نہ دی اور اسے نوچتا کاٹتا ہوا بولا۔

"مجھے آگے سے رجو نہ کہنا — میں ریاض ہوں ہوں، تمہارا شوہر — ...

میں بچہ نہیں ہوں، مرد ہوں سمجھیں نا؟

میں رجو نہیں ریاض ہوں ...

اور میں جو چاہے وہ کر سکتا ہوں سمی میری جان میری عورت ....

سات پردوں میں چھپی عورت، میں اتنی قدرت

رکھتا ہوں کہ تمہیں اپنے ہاتھوں ننگا کر سکوں۔"
سمی مارے شرم کے توبہ توبہ بھی نہ کہہ سکی۔
اس کا شوہر ریاض اسے اتنی مہلت تو دیتا ــ
اس کے ہونٹوں پر تو ہونٹوں ہی کا قفل
پڑ گیا تھا۔

" تمام شد "

قابلِ مطالعہ کتابیں!

حسنِ وصحت	رابعہ سعید	۹/- روپے
گھریلو چٹکلے	〃	۹/- 〃
آرائشِ گیسو	ثریا ستارہ	۹/- 〃
پانی سے علاج	سعید اے شیخ	۹/- 〃
گنجینۂ اقوال	〃	۹/- 〃
تمباکو نوشی یا جاں نوشی	〃	۹/- 〃
دل کی حفاظت کیجیے	〃	۹/- 〃
ترقی کی راہ پر	ڈیل کارنیگی	۱۰/- 〃
کامیابی کے راز	〃	۹/- 〃
ستمبر کا چاند	قرۃ العین حیدر	۹/- 〃
دلربا	〃	۹/- 〃
خوشبو وفا کی	فریدہ حق منجو	۱۵/- 〃
جینے کی آرزو	〃	۱۰/۵۰ 〃
مینا	〃	۱۵/۷۵ 〃
نیتو	〃	۱۵/- 〃
تجھ بن تیری یاد رہے	ذکا الزب رباب	۱۰/۵۰ 〃
شوگراں کی چاندنی	〃	۱۰/۵۰ 〃
منزلیں کھو گئیں	〃	۱۳/۵۰ 〃
سیاہ کار	〃	۱۵/- 〃
ہم بھی تیرے دل بھی تیرا	〃	۱۵/- 〃
نوریا	عذرا بیگ	۱۵/- 〃
پارہ	شہناز بٹ	۱۸/- 〃
سیلما	بلقیس ظفر	۱۵/- 〃
حیا	کوثر ضمیر	۱۵/- 〃
شمائیل	〃	۱۵/- 〃
میرے اپنے	زرینہ ضمیر	۱۲/- 〃
کنول رانی	〃	۱۴/- 〃
اور بھی دکھ ہیں	〃	۱۴/- 〃
پیاس کا صحرا	بدرالنساء شریف	۱۵/- 〃

رابعہ بُک ہاؤس ◎ بخشی مارکیٹ انارکلی لاہور

ستمبر کا چاند	قرۃ العین حیدر	۹ -
دلربا		۶ -
تنکے کا بوجھ	واجدہ تبسم	۲۱ -
کیسے سمجھاؤں		۹ -
[illegible]		۱۲
شوکراں کی چبھن	[illegible]	۱۰ ۵۰
[illegible]		۳ ۵۰
[illegible]		۲
چنبیلیاں		۸ -
[illegible]		۵ -
[illegible]	[illegible]	۹
[illegible]	[illegible]	۵
[illegible]	[illegible]	۵ -
[illegible]	[illegible]	۵

رابعہ بک ہاؤس بخشی مارکیٹ [illegible]